مفتی صدرالدین آزردہ

عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

مفتی صدرالدین آزردہ

(حیات، شخصیت، علمی اور ادبی کارنامے)

عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

پیش لفظ

مفتی صدر الدین آزردہ (۱۷۸۹ - ۱۸۶۸ء) عہد غالب کی اہم ترین اور معزز ترین شخصیتوں میں تھے۔ مسلم دور حکومت میں مسند افتا کو اور برطانوی دور اقتدار میں صدر الصدور کے عہدے کو عزت بخشی۔ مدت العمر درس و تدریس کے معزز اور مقدس فرض کو ادا کیا اور سرسید احمد خاں، نواب صدیق حسن خاں، نواب یوسف علی خاں، مولانا ابوالکلام کے والد ماجد مولانا خیر الدین اور مولانا فیض الحسن خاں جیسے مشاہیر کو ان کا شرف تلمذ حاصل رہا۔ غالب کے مخصوص احباب میں تھے افسوس کہ ایسی جامع حیثیات اور ہمہ گیر شخصیت پر اردو میں اب تک کوئی مبسوط کام نہیں ہو سکا ہے خوشی کی بات ہے کہ مولوی عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی نے اس فخر روزگار شخصیت اور اس کے علمی و ادبی خدمات پر ایک مفصل اور جامع کتاب لکھ کر اس علمی کھانچے کو پر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ عہد غالب کی مکمل تفہیم کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

پرواز اصلاحی صاحب ایک مردم خیز خطے، ضلع اعظم گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس ضلع کی مشہور درسگاہ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) کے فارغ التحصیل ہیں۔ فارسی زبان و ادب سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ اور اردو کے خوش گو شاعر اور اچھے نثر نگار ہیں۔ مفتی صدر الدین آزردہ پر لکھنے کے لیے ان خصوصیات اور صلاحیتوں کی سخت ضرورت تھی جو پرواز صاحب میں بدرجۂ اتم موجود ہیں

پیش نظر کتاب کے مسودے کو میں نے سرسری طور پر دیکھا اور میرا تاثر

ہے کہ یہ تصنیف محنت اور تحقیق سے لکھی گئی ہے اور موضوع زیر بحث کا حق مخلصانہ مگر غیر جانبدارانہ انداز میں ادا کیا ہے۔ اس میں آزردہ کی علمی و ادبی خدمات کے تمام پہلوؤں پر جس تفصیل سے بحث و گفتگو کی گئی ہے وہ دوسری جگہ ملنا ممکن نہیں۔ ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ جس طرح کیا گیا ہے وہ بھی لائق ستائش ہے ان کی شعر فہمی اور نکتہ سنجی ادبی چھیڑ چھاڑ، علم و وقار اور غالب کے "دوست غم گسار یار وفا شعار اور علامہ روزگار" کی جو تصویر اس تصنیف میں ملتی ہے وہ یقیناً اردو ادب میں ایک اضافہ کا حکم رکھتی ہے۔

مسعود حسین

صدر شعبہ
۲۸ جون ۱۹۷۷

جامعہ ملیہ اسلامیہ

فہرست مضامین

مقدمہ

مرنے سے پہلے بیمار سنبھالا لیا کرتا ہے مشرقی علوم و فنون کی ترقی ہو یا تہذیب و تمدن کا ارتقا، اخلاق و کردار کی جلوہ گری ہو یا شعر و سخن کی ہنگامہ آرائی، مغلیہ سلطنت کا آخری دور دہلی کا سنبھالا تھا۔ بادشاہت تو برائے نام رہ گئی تھی۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس دور نامسعود میں بھی دہلی کے اندر ہر فن کے کاملین کا ایک ایسا جمگھٹا ہو گیا جس کی نظیر ہندستان تو ہندستان دنیا کے کسی خطے میں ملنی دشوار ہے

فضائل کی جامعیت اور محاسن کی فراوانی کے لحاظ سے حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے فرزندان نامدار حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رح۔ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین رح۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر حضرت مولانا شاہ عبدالغنی رح یکتائے عصر ہی نہیں بلکہ گم گشتگانِ راہ حقیقت کیلیے بحر ظلمات میں روشنی کا مینار تھے۔

تبحّر علمی اور عبقریت میں حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رح۔ مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی رح۔ مولانا فضل امام خیرآبادی۔ ان کے فرزند مولانا فضل حق خیرآبادی رح نادرۂ روزگار تھے تو علم و فضل، زہد و اتقا میں مولانا شاہ محمد اسحاق رح مولانا مخصوص اللہ، مولانا نصیر الدین رح۔ مولانا عبدالخالق مولانا مملوک علی رح، مولانا رشید الدین رح۔ مولانا محمد یعقوب رح میاں صاحب سید نذیر حسین رح جیسی یگانہ اوصاف ہستیاں تھیں جن کے دریائے فیض سے تشنگانِ علم دور دراز گوشوں سے آ آ کر سیراب ہوتے تھے۔

نواب محمد مصطفیٰ خاںؒ شیفتہ۔ نواب قطب الدین خاںؒ جیسے جامع کمالات
بزرگ تھے۔ جن میں ریاست و امارت کے ساتھ علم و فن سے دلچسپی، زہد و ریاضت
فقر و درویشی کی صفات حمیدہ جمع تھیں۔

مشاہیر علماء میں مفتی سید رحمت علیؒ، مولانا نوازش علیؒ، مولانا امان علیؒ، مولوی
محمد جانؒ، مولوی محبوب علیؒ، مولانا علاء الدینؒ، مولانا رستم علیؒ، مولوی حاجی محمد
ملا سرفراز علیؒ، مولوی محمد بخشؒ عرف تربیت خاں، مولانا عبدالقادر رام پوریؒ
ملا محمد سعید پشاوریؒ، مولوی سدید الدینؒ، مولوی جلال الدین ہرویؒ، اخوند
شیر محمد قندھاریؒ، مولوی کرامت علی اسرائیلیؒ جیسے جید اور باصلاحیت اساتذہ
تھے جن کی علمی مجالس میں درسی فنون کی اعلیٰ اور منتہیانہ کتابوں کے نہ صرف اشکالات
پر فاضلانہ و محققانہ گفتگو ہوتی تھی، بلکہ ان کے دم قدم سے علوم اسلامیہ کی شمع
پوری آب و تاب کے ساتھ ضیا گستر تھی۔

صوفیائے کرام اور مشائخ عظام میں حضرت شاہ غلام علی نقشبندیؒ، شاہ
ابوسعیدؒ، ان کے فرزند شاہ احمد سعیدؒ و شاہ عبدالغنیؒ، حضرت شاہ محمد آفاقؒ، حضرت
شاہ غیاث الدینؒ، خواجہ محمد نصیرؒ (خواجہ میر درد کے نواسے) شاہ یوسف علیؒ، شاہ
رحیاتؒ، شاہ فدا حسینؒ، شاہ توکل حسینؒ، شاہ عسکری مجذوبؒ، شاہ عبدالغنیؒ
حضرت میر احمد دیوانہؒ، حضرت دین علی شاہؒ، اور حاجی غلام علی نقیب الاولیاء نصیر الدین
عرف کالے میاںؒ جیسے بزرگ اور درویش موجود تھے۔ جن کے فقر و درویشی کی عظمت کا
سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور جن کے حلقۂ ارادت میں ہزاروں بندگانِ خدا مادی
ترغیبات سے بے نیاز ہو کر عبادت و ریاضت اور اد و وظائف، تزکیۂ نفس اور اصلاح
باطنی میں مشغول تھے۔

اسی دور میں رئیس المجاہدین حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے نامور رفقاء
نے نہ صرف جہاد اسلامی کا غلغلہ بلند کیا بلکہ ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر
دوسرے سرے تک ہزاروں افراد میں دین کی عظمت و سربلندی کے لیے جاں سپاری اور

اور سر فروشی کا ولولہ پیدا کر دیا۔ دلوں میں ایمان و یقین کا ایک شعلہ بھڑکا دیا، جس کی تپش اور گرمی مدت دراز تک سرد نہ ہو سکی۔

اردو شاعری میں بانکپن اور نکھار دراصل اسی دور میں آیا۔ خاقانیٔ ہند شیخ ابراہیم ذوق۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب، حکیم مومن خاں مومن، مولوی امام بخش صہبائی، مولوی عبداللہ خاں علوی۔ میر نظام الدین ممنون۔ نواب ضیاء الدین نیر رخشاں۔ نواب زین العابدین خاں عارف، حافظ عبدالرحمن خاں احسان۔ حکیم آغا جان عیش۔ نواب غلام حسین محو۔ غلام علی خاں وحشت جیسے چمن معانی کے بلند پرواز طوطی اور گلشن شیوا بیانی کے بلبلانِ نغمہ سنج تھے۔

اسی دورِ زوال میں مفتی صدر الدین خاں آزردہ جیسے صاحب فضل وکمال پیدا ہوئے۔ ان کی شخصیت مجموعۂ اوصاف ہی نہیں گوناں گوں محاسن کا گنجینہ تھی۔ عالم باعمل ہی نہیں بلکہ فقیہہ بے مثل بھی تھے۔ صرف ونحو، منطق وفلسفہ، ریاضت و اقلیدس، معانی وبیان، ادب وانشا، فقہ وحدیث، تفسیر واصول میں فردِ فرید اور نادرۂ عصر تھے۔ علماء کی مجلس میں صدر نشین، شعراء کے جھمگھٹے میں میرِ مجلس حکام کے جلسوں میں موقر وممتاز، حکام رس وذی اقتدار ہی نہیں، بلکہ بے کسوں اور محتاجوں کے ملجا وماویٰ۔ طالبانِ علم وفن کے استاد ہی نہیں بلکہ سرپرست ومربی بھی تھے۔ اس دور میں کسی مکتبِ خیال کے لوگ ہوں ان کی سیرت وشخصیت سے متاثر نظر آتے ہیں۔ کوئی نہیں جو ان کے اوصافِ حمیدہ اور خصائلِ پسندیدہ کا معترف اور ان کے علمی وادبی ذوق کی بلندی کا مداح نہ ہو۔ زمانے نے جہاں بہت سے ارباب کمال کو طاقِ نسیاں کے حوالے کر دیا، وہاں اب ایک صدی کے بعد ان کی شخصیت بھی اوجھل ہوتی جا رہی ہے ویسے تو ان کے دور کے تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے۔ اور ان کے کلام کا انتخاب بھی دیا ہے۔ بعد کے مصنفوں نے بھی ضمناً ان کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کسی محقق اور ادیب نے مستقل طور پر ان پر کتاب لکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

مفتی صاحب کی شخصیت سے میں اُس وقت متاثر ہوا جب کہ مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی تحریریں پڑھیں۔ مولانا آزاد نے اپنے مضامین میں جس طرح ان کے اشعار برمحل دیے ہیں اس سے ان کی شاعرانہ عظمت کا نقش اُبھرتا ہے مرزا غالب پر لکھنے والوں نے جگہ جگہ مفتی صاحب کا ذکر کیا ہے جس سے ان کی شخصیت کے بعض پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد میں اسی ٹوہ میں رہا کہ ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کروں۔ چنانچہ میری جستجو بڑھتی گئی اور اس سلسلے میں خاصی کامیابی ہوئی۔ چنانچہ ان تمام مواد کو کتابی صورت میں مرتب کر کے ہدیۂ قارئین کر رہا ہوں۔ اور پہلی بار گویا اردو میں ان کی شخصیت، حالات زندگی، تعلیمی خدمات سیاسی کوائف، تصنیفات، تلامذہ اور ان کی نظم و نثر پر سیر حاصل کتاب پیش کی جا رہی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے اردو کی ایک بلند و بالا شخصیت اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کا صحیح معنوں میں تعارف ہو جائے اور اردو ادب میں ان کو وہی مقام دیا جائے جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔

بمبئی جیسے ہنگامہ گرم کن شہر میں تحقیق و ریسرچ کا کام آسان نہیں۔ اور پھر جبکہ مادی معاوضہ بھی پیش نظر ہو اس کے لیے اپنے کو آمادہ کرنا بڑا دشوار امر ہے۔ مگر موضوع سے ذاتی دلچسپی کچھ اس طرح پیدا ہوئی کہ یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا۔ کتاب کے کچھ ابواب پہلے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر بمبئی کے سہ ماہی رسالہ "ہندستانی زبان" میں اشاعت کے لیے دیے گئے۔ اس رسالے میں جتنا حصہ چھپا اسے دیکھ کر اردو کے نامور محققوں اور ادیبوں نے تحسین فرمائی اور بڑے حوصلہ افزا کلمات سے نوازا۔ اور اردو میں اس موضوع پر اتنی تفصیل سے قلم اٹھانے پر مصنف کی ہمت بڑھائی۔ بڑی خوشی اس وقت ہوئی جبکہ اس کتاب پر پیش لفظ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے وائس چانسلر ڈاکٹر مسعود حسین خانصاحب نے تحریر فرمانے کا وعدہ فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نہ صرف ہمارے ملک کے مشہور ماہر لسانیات، محقق، ادیب اور نقاد ہیں بلکہ علمی و تحقیقی کاموں

کی حوصلہ افزائی کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے۔ باوجود اپنی عدیم الفرصتی کے اُنھوں نے کتاب کا مسودہ پڑھا اور اپنی گرانقدر رائے لکھ کر اسے درجہ استناد بخشا، جس کے لیے صمیم قلب سے ڈاکٹر صاحب موصوف کا ممنون ہوں۔

میری دلی خواہش تھی کہ یہ کتاب ہندستان کے کسی وقیع ادارہ کی جانب سے شائع ہو۔ چنانچہ اس کے لیے مکتبہ جامعہ دہلی کا انتخاب کیا گیا۔ یہ ملک کا سنجیدہ۔ باوقار دارالاشاعت ہے جو اپنی بلند پایہ مطبوعات کی وجہ سے پوری دنیائے اردو میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ اس کے جنرل مینجر محترم شاہد علی خاںصاحب قدردان علم وفن ہی نہیں بلکہ مخلص وہمدرد بھی ہیں۔ کاغذ کی کمیابی اور گرانی کے باوجود اُنھوں نے جس طرح معیاری کتابوں کی اشاعت جاری رکھی، یہ ان کی انتہائی بلند حوصلگی اور عالی ظرفی کی دلیل ہے۔ ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کتاب کو مصنف کی ناموری وشہرت کے پیمانے سے نہیں ناپتے بلکہ اصل اہمیت ان کے نزدیک کتاب کا موضوع اور موادِ تحریر کی خوبی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بدولت اردو ادب کے سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ موصوف نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری لے کر بڑی حد تک میرا بار ہلکا کیا۔

اس کتاب کی تیاری میں بعض مخلصوں نے مفید مشورے دیے اور بعض نے مواد کی فراہمی میں مدد کی۔ ان میں سے خصوصیت کے ساتھ مخلص وکرم فرما (۱) ڈاکٹر عبدالستار دلوی ڈائرکٹر مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر بمبئی (۲) ڈاکٹر حامد اللہ ندوی صاحب (۳) عبدالرزاق قریشی صاحب مدیر نوائے ادب بمبئی (۴) عبداللطیف اعظمی صاحب، مدیر جامعہ دہلی (۵) مولوی عبدالرحیم صاحب مینجر رائٹرس امپوریم بمبئی۔ کا نہایت شکر گذار ہوں۔ جن لائبریریوں اور کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ان میں سے (۱) کتب خانہ مدرسۃ الاصلاح۔ سرائے میر۔ اعظم گڑھ۔ یوپی (۲) کتب خانہ محمدیہ

جامع مسجد بمبئی (۳) انجمن اسلام اردو ریسرچ لائبریری بمبئی (۴) مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر بمبئی کے معیاری ادارے لائق ذکر ہیں۔ جہاں قدیم کتابوں اور نوادر کا اچھا خاصا ذخیرہ دستیاب ہوا۔

امید ہے ارباب علم و ادب اس ناچیز تحفے کو قبول فرمائیں گے اور ہماری سعی مشکور ہوگی۔

عبد الرحمٰن پرواز اصلاحی
۱۵ - اپریل ۱۹۷۵ء
۱۲۵ - ڈمٹمکر روڈ بمبئی ۸

باب ۱

حالات زندگی

ولادت اور خاندان مفتی صاحب کے جد اعلیٰ خواجہ بہاء الدین خوارزمی فاروقی، شہنشاہ اکبر کے زمانے میں دہلی آئے اور بادشاہ کے ندماء میں شامل ہوئے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے وقت تک۔ یہ خاندان تجارت پیشہ رہا۔ مولوی خیر الدین ابو الخیر وہ بزرگ ہیں جنھوں نے آبائی پیشہ چھوڑ دیا۔ علم و عرفان کی طرف مائل ہوئے اور سرچشمہ شریعت و طریقت ہوئے۔ فقہ کی مشہور کتاب فتاویٰ عالمگیری مرتب کرنے والوں میں موصوف ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ وہ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی میں مدفون ہیں۔ ان کے فرزند مولانا فخر الدین امان اللہ شہید نے پدر بزرگوار سے بھی زیادہ عزت و شہرت حاصل کی۔ اپنے زمانے کے شیخ الاسلام تھے، چنانچہ لفظ "شیخ الاسلام" سے ان کی تاریخ وفات کا حساب لگایا جاتا ہے نادر شاہ و محمد شاہ سنہ ۱۱۵۱ھ ۱۷۳۸ء کی جنگ میں شہید ہوئے۔ مفتی صدر الدین آزردہ انھیں کے بھائی مولوی لطف اللہ کشمیری کے فرزند ارجمند تھے[1]۔

اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا کہ سنہ ۱۲۰۴ھ میں دہلی کے اندر مفتی صاحب پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت لفظ "چراغ" سے نکلتی ہے۔ مفتی صاحب کے والد نجابت و شرافت ہی کے لحاظ سے ممتاز نہ تھے، بلکہ ذی علم اور ذی حیثیت بھی تھے۔ دہلی کے شرفا، اور اپنے زمانے کے سربرآوردہ لوگوں میں ان کا شمار تھا۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے ایک مکتوب سے بھی پتہ چلتا ہے

---

[1] رسالہ معارف اعظم گڑھ۔ جلد ۵۹ ۱۹۴۷ء۔

کہ آپ کے دادا دہلی کے فضلائے معتبر میں سے تھے اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے مخلص احباب و شاگردوں میں سے تھے۔ چنانچہ مفتی صاحب جب حضرت شاہ عبد العزیز رح کے مدرسہ سے فارغ التحصیل ہوئے اور بسلسلۂ ملازمت کلکتہ جانے کا ارادہ کیا تو حضرت شاہ صاحب نے ازراہ شفقت مدرسہ کے مہتمم مولانا امین الدین [1] کو مندرجہ ذیل فارسی مکتوب تحریر فرمایا۔

دریں ولا مولوی صدر الدین صاحب کہ از فضلائے نامدار ایں بلد ما ہولہ اند و در اکثر فنون عقلی و نقلی از عربیت و ادب و اصول فقہ و کلام و ہم فنون فارسی مہارت دارند، و اکثر مراجعت تحقیقات نفیسہ علوم در فقیر خانہ نمودہ اند و معہذا نسبت ارادت و اتحاد با فقیر موروثی دارند و جد امجد ایشاں از فضلائے معتبر و مخلص اصحاب و تلامذہ در جناب حضرت والد ماجد فقیر بودند۔ نظم۔

القوم اخوان صدق بینہم سبب   من المودۃ لم یعدل بہ نسب

---

[1] مولانا محمد امین کے متعلق "تذکرہ روز روشن" میں ہے کہ علمائے عالی مقام اور فضلائے ذی احترام میں سے تھے۔ سرکاری مدرسہ عالیہ کلکتہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ مختصرات انھوں نے مولوی جمال الدین بہاری اور مطولات مولوی محمد ناظم الہ آبادی سے پڑھیں۔ تفسیر و حدیث کی تعلیم حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی سے حاصل کی۔ ان کی زندگی زیادہ تر درس و تدریس کے مشغلے اور طاعت و عبادت میں گزری۔ میر زاہد پر حاشیہ لکھا۔ مسلم الثبوت کی شرح لکھنے کا آغاز کیا تھا کہ پیام اجل آپہنچا۔ فارسی میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ حضور سرور کائنات صلعم کی نعت مبارک میں ان کا قصیدہ بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کا مندرجہ ذیل شعر تو اکثر ارباب علم کی زبانوں پر جاری ہے۔

مخدرات سراپردہ ہائے قرآنی   چہ دلبر اند کہ دل می برند پنہانی

روز روشن مصنفہ مظفر حسین ص ۲۷-۷۶، مطبع شاہجہانی بھوپال ۱۲۹۶ھ

عازم دارالامارۃ کلکتہ بتقریبات چند درچند اند۔ انشاء اللہ تعالےٰ ملاقات سامی خواہند نمود۔ مراعات مہمات مذکورہ در حسن تلقی و اعزاز و اکرام ایشاں مہما امکن مد نظر سامی باشد۔ والسلام'' [۱]

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بھی آپ کی خاندانی شرافت کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے: ''فی الجملہ مولانا از دودہ بزرگ است۔ بزرگانش از علم و اعتبار بودہ اند۔ مولد و منشاء دی ہمیں بقعہ مبارک است۔''

دہلی کے مشہور عالم اور مناظر مولانا رشید الدین خاں دہلوی مصنف صولت غضنفریہ کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا۔ مولوی سدید الدین اور مولوی مفتی قوام الدین جیسے ارباب علم بھی اسی خاندان سے نسبت رکھتے تھے۔ ہر دور میں علم وفن اور وجاہت و ثروت ساتھ ساتھ اس خاندان میں قائم رہی۔ بزرگوں سے عقیدت، واحترام، علماء و فضلا کی قدردانی اس خاندان کی مخصوص صفت تھی۔ ذہانت و فطانت اور علوم و فنون سے دلچسپی، فیاضی و سخاوت اور تہذیب و شائستگی کے اوصاف مفتی صاحب کو بڑی حد تک ورثے میں ملے تھے۔ پھر خاندان ولی اللہی کے فیضان نظر نے مزید چار چاند لگا دیئے۔

تعلیم و تربیت۔ ہر دور کا تعلیمی نظام اپنے عہد کی سماجی اور اقتصادی ضرورتوں کے مطابق ترتیب پاتا ہے۔ نصاب تعلیم اور اس کے مختلف مدارج و مراحل اسی کے لحاظ سے مقرر کیے جاتے ہیں۔ معاشی کفالت کے ساتھ مناصب اور عہدے۔ خوشحالی و فارغ البالی، ہم چشموں میں عزت و مرتبہ حاصل کرنے کی فکر، ہر دور میں موجود رہی ہے۔ لیکن یہ خصوصیت صرف مسلمانوں ہی کی رہی ہے کہ ان کا تعلیمی نظریہ دنیا کی تمام قوموں سے الگ اور

---

[۱] اتحاف النبلاء المتقین باحیاء ماثر الفقہاء المحدثین مصنفہ نواب صدیق حسن خاں ص ۲۶۱ مطبع نظامی ۱۲۸۸ھ ؁ [۲] گلشن بیخار ص ۱۲

جداگانہ رہا ہے۔ ان کے نزدیک علم کا سب سے بڑا مقصد دین کا حصول رہا ہے۔ اس کے بعد رہے دنیاوی مفادات تو اس کا درجہ ثانوی رہا ہے۔ اس زمانے میں بھی تمام تعلیمی تصورات میں اخلاقی، مذہبی رجحان کا غلبہ رہا۔ دنیاوی معاملات و ضروریات ہوں یا سماجی و معاشرتی تعلقات۔ تمام اقدار کا محور دین ہی رہا ہے تعلیم سے لے کر سیاست و معیشت تک سب اسی کے دائرے میں تھے۔ اس لیے جو لوگ باقاعدہ علوم و فنون حاصل کرنا چاہتے تھے یا فقیہ و محدث اور عالم بننا چاہتے تھے۔ ان کے لیے ملک کے ہر گوشے میں ایسے تعلیمی مراکز موجود تھے۔ پھر دلی تو گویا گہوارۂ علم تھی۔ معقولات ہوں یا منقولات دونوں کے مراکز دلی میں پائے جاتے تھے۔ جہاں اس دور میں دلی کے اندر شاہ غلام علی کی خانقاہ کا مدرسہ۔ بازار خانم کا مدرسہ اجمیری دروازے کا مدرسہ۔ غازی الدین خاں کے مدرسے تھے۔ وہاں خاندان ولی اللٰہی کی سب سے بڑی درسگاہ مدرسۂ رحیمیہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز کا سرچشمہ علم بھی جاری تھا۔ مفتی صاحب نے ہوش سنبھالا تو ولی اللٰہی مسند علمی پر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے بھائی حضرت شاہ رفیع الدینؒ۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کو متمکن پایا۔ منقولات میں ان اصحاب ثلاثہ کا ڈنکا بج رہا تھا تو دوسری طرف معقولات میں حضرت مولانا فضل امام خیرآبادیؒ کا سکہ چل رہا تھا۔

مفتی صاحبؒ نے ابتدائی تعلیم تو اپنے والد ماجد مولانا لطف اللہ کشمیری سے حاصل کی۔ علوم اسلامیہ میں عربی ادب، معانی و بیان۔ فقہ و اصول۔ کلام و تفسیر کے لیے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ حدیث و اصول حدیث۔ رجال و سیر وغیرہ کی کتابیں حضرت شاہ عبدالقادرؒ اور حضرت شاہ رفیع الدینؒ سے پڑھیں۔ کچھ دنوں حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ سے بھی استفادہ کیا منطق و فلسفہ، ریاضیات و اقلیدس وغیرہ کی تعلیم حضرت مولانا فضل امام خیرآبادیؒ

۱؎ تذکرہ علمائے ہند رحمان علی صفحہ ۹۳ و اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین صفحہ ۲۶۰ مطبع نظامی ۱۲۸۸ھ و ابجد العلوم الجزء الثالث صفحہ ۱۹۶ مطبوعہ صدیقیہ بھوپال۔

سے حاصل کی۔ حقیقت میں اس دور کے اندر یہی وہ اساتذۂ علم وفن تھے جو نہ صرف اپنے اپنے فنون میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے، بلکہ پورے ہندوستان میں انھیں درجہ استناد حاصل تھا۔ ملک کے گوشے گوشے سے شیدائیانِ علوم والہانہ طور پر انھیں کے آستانۂ علمی پر آکر حاضری دیتے۔ اور انھیں کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے تھے۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ۔ اور مولانا فضل الحق خیرآبادی دونوں ہم سبق اور دوست تھے۔ منقولات کا درس خاندان ولی اللہی کے بزرگوں سے لیتے اور معقولات مولانا فضل امام خیرآبادی سے پڑھتے۔

مولانا فضل امام[1] اس زمانے میں صدر الصدور تھے۔ فرائض منصبی کے علاوہ بقیہ اوقات میں طلبہ کو پڑھاتے۔ مکان کے علاوہ دربار آتے جاتے مولانا فضل حق اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ ہاتھی یا پالکی میں ساتھ جاتے اور اسباق بھی ساتھ ہی پڑھتے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ علم کی عظمت سکھائی جاتی تھی۔ استاد کی قدمت کے طریقے بتائے جاتے تھے۔ مولوی اکرام اللہ بروایت مفتی انعام اللہ گوپامئوی، مولانا احمد علی بروایت مولانا ماجد علی اور مولانا بدرالدین علوی بروایت استاذ العلما مولانا لطف اللہ علی گڑھی اس کے راوی ہیں کہ ایک روز علامہ فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین خاں یہ باتیں کرتے آرہے تھے کہ اس خاندان کے لوگ علوم دینیہ حدیث فقہ، تفسیر وغیرہ خوب جانتے ہیں مگر معقولات نہیں جانتے۔ یہ دونوں شاہ صاحب تک پہنچے بھی نہ تھے کہ شاہ صاحب نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ ایک بوریا مسجد سے باہر صحن میں ڈال دو۔

اور ایک مسجد کے اندر بچھا دو۔ اور جب فضل حق اور صدرالدین آئیں تو ان کو

---

[1] الثورۃ الھندیہ یعنی باغی ہندوستان صہ ۲۹ عبدالشاہد خاں شروانی

وہیں صحن میں بٹھا دینا۔ ان کے آنے پر شاہ صاحب تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ میاں آج سبق پڑھانے کو جی نہیں چاہتا۔ البتہ یہ جی چاہتا ہے کہ کچھ معقولیوں کی خرافات پر گفتگو ہو۔

یہ دونوں اس میدان کے مرد تھے ہی فوراً بولے "جیسی حضرت کی خوشی" شاہ صاحب نے کہا کہ کوئی مسئلہ لو قوی پہلو تم اختیار کرو۔ اور کمزور مجھے دو چنانچہ حصول الاشیاء بانفسہا دباشباحہا" پر گفتگو شروع ہوئی۔ شاہ صاحب نے دلائل سے "باشباحہا" کے قول کو ثابت کر دکھایا۔ بالآخر دونوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ شکست تو کھا گئے۔ لیکن یہ شکست روحانیت سے کھائی ہے۔ علمیت سے نہیں۔ لاجواب تو ہو گئے لیکن بات وہی ٹھیک ہے جو ہم کہتے ہیں۔ (یہ بڑا معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ علامہ فضل حق نے حاشیہ قاضی مبارک میں اس پر مفصل اور مدلل خامہ فرسائی فرمائی ہے)

شاہ صاحب نے فرمایا کہ "تم یہ نہ سمجھو کہ ہم کو معقول نہیں آتی۔ ہم نے اس کو ناقص اور واہیات سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ مگر اس نے ہمیں اب تک نہ چھوڑا، وہ ابھی تک ہماری قدم بوسی کیے جاتی ہے"

اس مباحثہ سے شاہ صاحب کا مقصد صرف تنبیہہ تھا کہ اساتذہ کی جانب سو ظنی حصول علم سے مانع ہوتی ہے۔ استاد اور شاگرد کے درمیان عقیدت ہی کا رابطہ ہوتا ہے جو افہام و استفہام میں معین و مددگار رہتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس دور میں کامل کے بجائے ناقص اور لائق کے بدلے نالائق افراد کی بہتات ہے۔

مولانا فضل حق اور مفتی صاحب دونوں مولانا فضل امام سے منطق و فلسفہ کا درس لے رہے تھے۔ ایک بنگالی طالب علم بھی وہاں آ گیا۔ اور مولانا سے بولا آپ کا نام سن کر دور سے آ رہا ہوں۔ آپ نے اشارہ سے ایک جانب بیٹھنے کو کہا۔ جب پڑھا چکے۔ مخاطب ہوئے۔ طالب علم بولا۔ آپ سے مجسطی بطلیموس پڑھنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا میری رائے میں مولوی شاہ عبدالقادر کے درس

میں جا بیٹھو۔ وہاں تمہاری مراد پوری ہو جائے گی۔ طالب علم یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا سر جھکا کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ دوپہر کا کھانا محل سرا سے آیا۔ شام ہوئی مولانا صدر الصدوری کا کام انجام دے کر گھر آئے۔ نواکہات کا شغل کیا۔ نماز عصر سے فارغ ہو کر محل سرا سے باہر آئے۔ مفتی صدر الدین خاں اور مولانا فضل حق آن بیٹھے۔ سبق ہونے لگا۔ حسن اتفاق سے درس میں مجسطی ہی کا سبق تھا۔ ادھر ملنے جلنے والے آ گئے۔ بنگالی اپنی جگہ سے اٹھا۔ درس میں آ بیٹھا۔ اور یہ رنگ دیکھتا رہا۔ احباب بات چیت کر کے سدھارے مولانا سے آنکھوں میں آنسو لا کے بولا حضور! مجھ سے ایسی کیا خطا ہوئی کہ مجھ کو ٹالا جا رہا ہے۔ حضور مجسطی پڑھا رہے تھے۔ مجھے حکم ہے شاہ صاحب کے پاس جاؤں۔ مولانا مسکرا دیے۔ کہنے لگے میاں مجسطی ہر کوئی مدرس پڑھا سکتا ہے۔ مگر شاہ صاحب اس طرح پڑھاتے ہیں جیسے حکیم بطلیموس صاحب مجسطی پڑھا رہا ہو تمہاری خوشی ہے مجھ سے ہی پڑھ لیا کرو۔"[1]

سلسلہ تلمذ :- مفتی صدر الدین آزردہ کا سلسلہ تلمذ یوں ہے۔

منقولات میں : ۱۔ مفتی صدر الدین آزردہ ۔ ۲۔ حضرت شاہ عبد العزیز و حضرت شاہ رفیع الدین و حضرت شاہ عبد القادر۔ (۳) حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ ۴۔ شیخ ابو طاہر مدنی۔ ۵۔ شیخ ابراہیم کردی (۶) احمد قشاشی۔ ۷۔ الشمس محمد بن احمد الرملی۔ ۸۔ الزین زکریا الانصاری۔ ۹۔ حافظ ابن حجر عسقلانی ۱۰۔ ابراہیم بن احمد التنوخی المعروف بالبرہان الشافعی۔ ۱۱۔ الشیخ احمد بن ابی طالب الحجاج۔ ۱۲۔ ابو عبد اللہ الحسین بن مبارک الزبیدی البغدادی ۱۳۔ ابو الوقت عبد الاول بن عیسیٰ بن شعیب بن السجزی الصوفی الہروی

---

[1] مشاہیر جنگ آزادی ص ۹۳ از مفتی انتظام اللہ شہابی

۱۴۔ جمال الاسلام ابوالحسن عبدالرحمٰن بن محمد الداودی۔ ۱۵ ابو محمد عبداللہ بن احمد حمویہ السرخسی۔ ۱۶۔ ابو عبداللہ محمد بن یوسف مطر الفربری۔ ۱۷ ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم البخاری۔

معقولات میں: ۱۔ مفتی صدرالدین آزردہ۔ ۲۔ مولانا فضل امام خیرآبادی ۳۔ مولانا عبدالواحد کرمانی خیرآبادی۔ ۴۔ ملا محمد اعلم سندیلوی۔ ۵۔ مولانا کمال الدین سہالوی و ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی۔ ۶۔ ملا قطب الدین سہالوی شہید و ملا امان اللہ بنارسی۔ ۷ مولانا دانیال جوراسی۔ ۸۔ مولانا عبدالسلام دیوی۔ ۹ مولانا عبدالسلام لاہوری۔ (۱۰) امیر فتح اللہ شیرازی۔

مولانا دانیال جوراسی کا سلسلۂ تلمذ علامہ جلال الدین محقق دوانی اور ان سے سید شریف ابوالحسین جرجانی اور پھر علامہ جرجانی سے شیخ الرئیس بوعلی سینا المتوفی ۴۲۷ھ تک پہنچتا ہے[1]

صدرالصدوری کا منصب

یہ عہدہ[2] تنخواہ اور منصب کے لحاظ سے انگریزی دور کے جج کے برابر تھا۔ لیکن معزز ترین عہدہ شمار کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا عمل دخل بڑھا تو انگریزوں کو اس بات کی فکر ہوئی کہ مسلمانوں کے علماء خاندانی شرفاء

---

[1] الثورۃ الہندیہ صہ ۹۱ و ۹۲

[2] صدرالصدور یا صدر کے عہدہ کے متعلق دیکھئے اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۔ صہ ۱۱۴ سیر المتاخرین تصنیف ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء مطبع لکھنؤ ۱۳۱۴ھ جلد دوم صہ ۸۲۸ پر صدر الصدوری کا حال مفصل دیا ہے۔

(برائے امتحان قضاۃ و تحقیق احوال ارباب استحقاق و املاک دائمیہ مقرر بودند) مغلوں اور سابقہ دور کے متعلق آئین اکبری میں تفصیلات ملیں گی۔

ارباب علم و ذی وجاہت افتاء و صدارت کے مناصب قبول کریں۔ اس لیے اسی دور کے اکثر اکابر و افاضل کو اس عہدہ پر سرفراز کیا گیا۔

چونکہ دہلی پایۂ تخت تھا اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا مرکز۔ اس لیے یہاں کی صدارت کے لیے ایسے ارباب علم و فضل کو انتخاب کیا جاتا جو اس کے لیے زیادہ سے زیادہ موزوں ثابت ہوں۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کے والد ماجد مولانا فضل امام خیرآبادی صدر الصدور بنائے گئے۔ ان کے بعد ان کے شاگرد رشید مفتی صدر الدین آزردہ کو اس عہدہ پر سرفراز کیا گیا۔ اس سلسلے میں ان کے متعلق انگریزی ریذیڈنٹ نے اکبر شاہ ثانی بادشاہ سے مشورہ بھی کر لیا تھا۔

نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں۔

مفتی صاحب کو انگریزی حکومت نے ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء کے قریب صدر الصدور اور مفتی دہلی مقرر کیا۔ اور اس حیثیت سے وہ مغربی بلکہ مشرقی و شمالی دہلی میں فتوے دیتے تھے۔ اور امتحان مدارس و صدارت حکومت دیوانی بھی ان کے سپرد تھی۔ تینتیس ۳۳ سال تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔" [1]

لیکن بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابتدا میں مفتی صاحب کو صدر امین بنایا گیا۔ بعد میں پھر ترقی دیکر صدر الصدور کر دیا گیا۔ [2]

انگریز ریذیڈنٹ آپ کی سیاسی سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی کے بڑے معترف تھے۔ ڈیوڈ اکٹر لونی جو ۱۸۱۸ء سے ۱۸۲۰ء تک دہلی کے ریذیڈنٹ رہے جب آپ راجستھان کی سیاسی مہم پر جانے لگے تو مفتی صدر الدین آزردہ جنرل ڈیوڈ اکٹر لونی کے ساتھ اجمیر پہنچے اور جے پور کے سفر میں ان کے ساتھ رہے جنرل اور اس کے داماد کی کلید دانش رہے۔ چار سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی صاحب

---

[1] اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین صفحہ ۲۶۲ [2] چنانچہ آگرہ گزٹ (انگریزی ۱۸۴۳ء) صفحہ ۱۹۸ میں ہے کہ ۱۵ جون ۱۸۴۳ء کو دلی میں صدر الصدور بنایا گیا"

ممدوح نے ان کی تعریف میں دفتر کے دفتر صدر کو لکھ مارے۔ اور اس قدر ان پر اعتماد کیا کہ رلیواں، سرسال اور راجہ جے پور کی والدہ کے درمیان تکرار کے قضیہ میں مفتی صدرالدین کو پولیٹیکل ایجنٹ پر امین مقرر کیا۔ اور ان کے متعلق لکھا کہ فاضل، زود فہم، خوش تقریر، دوست نواز اور دشمن گداز ہیں۔" [1]

ڈیوڈ اکٹر لونی کی سفارش اور وساطت سے یہ انگریزی ملازمت میں داخل ہوئے۔ اور آخر صدر الصدوری کے منصب پر پہنچے۔ یہ منصب مفتی صاحب نے جس فرض شناسی، ذمہ داری اور دیانت کے ساتھ انجام دیا اس کی داد نہ صرف انگریزی حکومت کے اعلیٰ افسروں نے دی بلکہ عوام و خواص رعایا میں بھی اس کے چرچے رہے۔

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ لکھتے ہیں۔

"جھگڑوں کے فیصلہ کرنے پر مامور ہیں جو منصب اعلیٰ ہے جس کو اہل فرنگ کی اصطلاح میں صدر الصدور کہتے ہیں۔ فی زمانہ ان کی سلطنت میں اہل ہند کے لائق اس سے بڑا کوئی عہدہ نہیں ہے۔ مولانا نے اس دنیوی کسب معاش کے ذریعے کو دینی ثواب حاصل کرنے کا وسیلہ بنا رکھا ہے۔ کیونکہ ان کی تمام تر کوشش مخلوق کی حاجت روائی میں صرف ہوتی ہے۔ ان کے انصاف کی برکت ہر خاص و عام پر محیط ہے۔" [2]

مولوی کریم الدین لکھتے ہیں۔

یہ عہدہ اس شخص کے واسطے ہی زیبا تھا۔ اور در واقع میں ہر ایک مقدمہ کی وہ ایسی تحقیق کرتے ہیں کہ یقیناً کوئی فیصلہ ان کا خالی حق سے نہیں ہوتا۔ حق دار کو حق پہنچانے میں اس لیے اب میں یہ کہتا ہوں کہ خدا تعالے تا قیام قیامت اس شخص

---

[1] علم و عمل یعنی وقائع عبدالقادر خانی صفحہ ۲۷۳ شائع کردہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ کراچی [2] گلشن بیخار صفحہ ۱۲

کو اس عہدہ پر قائم رکھے تاکہ ظلم جہاں سے یک قلم موقوف ہو" ؎۱

تھوڑے ہی دنوں میں آپ کے عدل و انصاف کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ عدل گستری کے لیے مثال دی جاتی تو مفتی صاحب کے فیصلوں کی۔ بشیر الدین احمد کہتے ہیں۔

" عدل و انصاف، فریاد رسی عباد افضل عبادات ہے۔ منصب صدارت کو اپنے ذمہ لیا اور بلا رو رعایت اور لگاؤ کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرتے رہے لوگوں کے دلوں پر معدلت، راست بازی، حق پژوہی دیانت و امانت کا نہ مٹنے والا سکہ بٹھا گئے۔ دل رنجور کے لیے مرہم کافور۔ ظالموں اور اشرار کے لیے تادیب وہی میں مشہور۔ دبدبہ و شوکت ظاہری سے ان کے دربار میں بولنا محال۔ کوئی زبان کھول سکے کیا مجال۔ باوجود مراتب بلند و مناصب ارجمند کے اخلاقِ محمدی سے متصف افادۂ علوم و افاضت مسائل دینی کے وقت ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو عام آزادی ہے نہ روک ہے اور نہ ٹوک" ؎۲

جس زمانے میں مفتی صاحب عدالت کیا کرتے تھے۔ دلی کی عدالتیں مشن کالج کشمیری گیٹ پر تھیں کہا جاتا ہے کہ آپ کی میز پر ایک لمبا بالنس رکھا رہتا تھا جب عدالت میں زیادہ شور و غل ہوتا تھا تو بالنس بجادیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک ناخوش گوار واقعہ بھی پیش آیا۔ آپ مغلوں کی گلی میں مرزا محمد علی بیگ خلف مرزا خدا بخش خاں قزلباش رسالدار میجر کے لڑکے کو گرفتار کرنے گئے تو مغل بچے مفتی صاحب سے برے انداز میں پیش آئے۔ یہاں تک کہ اس کو گرفتار نہ کرسکے آپ کی عمر میں یہ پہلا واقعہ تھا جو آپ کے وقار کے خلاف اور تکلیف دہ گزرا ؎۳

؎۱ تذکرہ فرائد الدہر صفحہ ۳۹۶

؎۲ واقعات دار الحکومت جلد دوم صفحہ ۱۴۸ مصنف بشیر الدین احمد شمسی پریس آگرہ ۱۹۱۹ء

؎۳ کرزن گزٹ دہلی ۸ مارچ ۱۹۱۲ء

ایک دفعہ آپ کے دوست مرزا غالب بہت مقروض ہو گئے۔ قرض خواہوں نے ان پر مقدمہ دائر کر دیا۔ مفتی صاحب کی عدالت تھی۔ جس وقت پیش ہوئے تو یہ شعر پڑھا ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

یہ سنتے ہی مفتی صاحب مسکرا دیے۔ اور اپنے پاس سے ان کے قرض کا روپیہ ادا کر دیا۔[1]

مفتی صاحب کی انصاف پسندی اور اعلیٰ کارکردگی کی دھوم صرف عوام ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ بادشاہ اور گورنر تک کو اس کا اعتراف تھا ۱۵، ۱۷ نومبر ۱۸۲۵ء کو گورنر جنرل بہادر نے دہلی میں دربار کیا۔ ۱۷ نومبر کے دربار میں ۲۷ حضرات کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ مولانا مملوک العلی مدرس اول کو خلعت سہ پارچہ مرحمت ہوا۔ اسی طرح مرزا اسد اللہ خاں غالب کو خلعت ہفت پارچہ سہ رقم جواہر اور مفتی صدر الدین خاں بہادر صدر الصدور دہلی کو خلعت سہ پارچہ اور ایک گھنٹہ ملا۔[2]

اسی طرح بہادر شاہ کے روزنامچے میں ہے کہ:

"۱۹ دسمبر ۱۸۵۵ء۔ مولوی صدر الدین صاحب بہادر کے نذرانہ پیش کرتے وقت نواب گورنر جنرل بہادر کے سکریٹری نے کہا۔ آپ لوگوں کی دیانتداری اور انصاف پسندی، نیک نامی اور علم فراست سے بہت مسرور اور رضامند ہیں۔[3]

مغلیہ حکومت کے چل چلاؤ کے دن تھے۔ اس بات کو ہر دور اندیش نے محسوس کر لیا تھا۔ مفتی صاحب کو مغلیہ خاندان سے دیرینہ تعلق تھا۔ اس لیے بادشاہ

---

[1] خمخانۂ جاوید حصہ اول

[2] دہلی کا آخری سانس از سید محمد ناصر دہلوی ص ۱۳۶

[3] بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۳۵

کی جانب سے انھیں جو کچھ ملتا تھا اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔ اور بطور تبرک اس کی قدر کرتے تھے۔ ناصر نذیر فراق لکھتے ہیں۔

"صدر الصدور مفتی صدر الدین صاحب کو صدر الصدوری کی تنخواہ کے سرکار کمپنی سو روپے دیتی تھی۔ اور بادشاہ سلامت کے خزانہ سے مفتی صاحب کے منصب کے دو روپے آٹھ آنے ملتے تھے۔ وہ بھی محبوب علی خواجہ سرا نے وزیر ہو کر بند کرا دیے۔ مفتی صاحب نے بادشاہ سلامت کے ہاں ڈھائی روپے کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اور باقاعدہ مقدمہ لڑ کر روپے جاری کرائے۔ صاحب کمشنر دہلی نے مفتی صاحب سے کہا۔ آپ کو ہماری سرکار ہزار روپے سے اوپر دیتی ہے۔ آپ نے ڈھائی روپے کے لیے اتنی کھکھیڑ کیوں اٹھائی؟ مفتی صاحب نے کہا آپ کے ہزار بارہ سو روپے پر ڈھائی بھاری ہیں۔ یہ تبرک ہے اس پر ہمیں فخر ہے"[1]

اس وقت علمائے دین اور مشائخ کا ایک طبقہ انگریزوں کی ملازمت کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ انگریزی حکومت کو غاصبانہ اور ظالمانہ حکومت خیال کرتا تھا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے بھی فتویٰ دیا تھا کہ انگریزی حکومت سے تعاون جائز نہیں۔ اسی بناء پر شاہ عبدالغنی صاحبؒ مہاجر مدنی بھی انھیں بزرگوں کی طرح مفتی صاحب کی صدر الصدوری کو خلاف تقویٰ سمجھتے تھے۔ حالاں کہ مفتی صاحب کو آپ کی ذات والاصفات سے بڑی عقیدت تھی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ شاہ عبدالغنی صاحب کے یہاں کئی دن فاقہ ہوا۔ اس کا تذکرہ ان کی ماں نے کہیں کر دیا۔ اس کی خبر کسی ذریعے سے مفتی صدر الدین خاں صاحب کو بھی ہو گئی۔ مفتی صاحب نے تین سو روپے شاہ صاحب کی خدمت میں بھجوا دیے۔ شاہ صاحب نے وہ روپے واپس کر دیے اس پر مفتی صاحب وہ روپے لے کر خود حاضر ہوئے اور تخلیہ میں پیش کیے۔ اور

---

[1] لال قلعہ کی ایک جھلک ص ۲۷

فرمایا کہ شاید حضور کو خیال ہو کہ یہ صدر الصدور رشوت لیتا ہوگا۔ اس لیے میں عرض کرتا ہوں کہ رشوت نہیں لیتا۔ بلکہ یہ روپے میری تنخواہ کے ہیں۔ آپ ان کو قبول فرمالیجیے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ مجھے تو یہ وسوسہ کبھی نہیں گزرا کہ تم رشوت لیتے ہوگے۔ میں البتہ تمھاری نوکری کو اچھا نہیں سمجھتا۔ اس لیے میں ان کو لینے سے معذور ہوں۔[1]

اسی طرح امیر خاں صاحب نے فرمایا کہ ایک مرتبہ مفتی صدر الدین خاں صاحب نے شاہ عبد الغنی صاحب کے یہاں سے کچھ کتابیں مستعار منگائیں۔ شاہ صاحب نے بھیجدیں۔ جلدیں شکستہ تھیں۔ مفتی صاحب نے واپسی کے وقت نئی جلدیں بندھوا کر واپس کردیں۔ جب شاہ صاحب کے پاس کتابیں پہنچیں۔ شاہ صاحب نے جلدیں توڑ کر مفتی صاحب کے پاس واپس فرمادیں اور کہلا بھیجا کہ جا لے وہی پرانے پٹھے بھیج دو۔[2]

---

[1] امیر الروایات ص۱۲۱ [2] ایضاً

باب ۲

تعلیمی خدمات

حلقۂ درس مفتی صاحب کا تدریسی لحاظ سے بھی دلی کے سربرآوردہ علماء میں شمار تھا۔ معقولات و منقولات میں اعلیٰ درجہ کی دستگاہ رکھتے تھے علمی و ادبی ذوق کے علاوہ آپ کو جس کام سے سب سے زیادہ دلچسپی تھی وہ درس و تدریس کا مشغلہ تھا فرائض منصبی کی ادائیگی کے بعد اونچے درجہ کے طلبہ کو اپنے گھر پر پڑھاتے۔ علمائے سلف کے طریقے پر بلا معاوضہ اور بلا اجرت، درس دیتے۔ آپ کی آمدنی کا بڑا حصہ طلبہ کی کفالت پر خرچ ہوتا۔ طلبہ کا ماہانہ وظیفہ مقرر تھا۔ اور لباس تک آپ ہی دیتے تھے۔ جمعہ کو جو تعطیل ہوتی اس میں تمام طلبہ کو اپنے ہمراہ لے کر باغ جاتے۔ طرح طرح کے میوے اور لذیذ کھانے کھلاکر خوش ہوتے۔ [۱]

آپ کی فیاضی، علم پروری اور طلبہ کے ساتھ حسن سلوک کی شہرت ہندوستان کے گوشے گوشے تک پہنچی ہوئی تھی۔ دور دور سے طلبہ آتے معقولات و منقولات کی تحصیل کرتے۔ بہت سے استفادہ کرتے۔ کچھ بطور تبرک یا محض آپ سے نسبت تلمذ کے لیے چند اسباق فاتحہ فراغ پڑھ کر سند حاصل کرنے اور زمرۂ فضلا میں شمار ہوتے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں۔

"فضلائے عصر بتلمذ ایشاں سر بلند دارند۔ خلقی کثیر فاتحہ فراغ درحلقہ درس ایشاں خواندہ اند مردم بلاد دور دست بعد تحصیل

---

[۱] گل رعنا۔ صفحہ ۳۲۷

وتکمیل علومِ متداولہ وفنونِ رسمیہ بحضرت الیشاں رسیدہ۔ یک دو سبق یا مختصرے در علم خواندہ فراغ حاصل می نمودند۔ ودر محصلین واہل فضیلت معدود می شدند"۔ ؎

اس زمانے میں اسکولوں یا کالجوں یا موجودہ دور کے بعض عربی مدارس کے طریقہ پر جماعت بندی یا کلاس سسٹم نہ تھا۔ طلبہ کو اپنی دماغی صلاحیتوں کے اعتبار سے پوری آزادی کے ساتھ آگے بڑھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں مفتی صاحب سے دلی میں پڑھتے تھے۔ مفتی صاحب نے ان کی خاص دماغی حالت کو دیکھ کر ان کے لیے اسباق کا الگ انتظام کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ یہ بیان خود نواب صاحب کے اپنے قلم کا قلمبند کیا ہوا ہے۔

"ایک سال آٹھ ماہ کی مدت میں کتب دانش مندی کو سبقاً سبقاً حاصل کیا۔ تحصیل کی سند حاصل کی۔ کتب متداولہ علوم رسمیہ جن کو اس مدت میں حاصل کیا یہ ہیں۔

۱۔ مختصر معانی تا آخر۔ ۲۔ عبادات شرح وقایہ۔ ۳۔ معاملات ہدایہ۔ ۴۔ اوائل توضیح۔ ۵۔ وتلویح اصول فقہ میں۔ ۶۔ سلم۔ ۷۔ مع ملا حسن۔ ۸۔ وحمد اللہ ۹۔ و قاضی مبارک منطق میں۔ ۱۰۔ میبذی تمام۔ ۱۱۔ و قدرے شمس بازغہ۔ ۱۲۔ وصدرا مایعم الاجسام تک۔ ۱۳۔ میر زاہد ملا جلال تا بحث دلالت۔ ۱۴۔ میر زاہد شرح مواقف تا بحث وجود ۱۵۔ میر زاہد رسالہ تا مذہب منصور۔ ۱۶۔ صحیح بخاری میں جزء سماعاً ۱۷۔ اول تفسیر بیضاوی قرأۃً ۱۸۔ دیوان متنبی نصف اول ۱۹۔ بعض دیوان الحماسہ۔ ۲۰۔ سبعہ معلقہ۔ ۲۱ مقالہ اقلیدس ۲۲۔ قطبی مع میر۔ ۲۳۔ شرح عقائد نسفی تمام۔ ۲۴۔ حاشیہ بحر العلوم بر میر زاہد ۲۵۔ مقامات حریری وہمدانی۔ ۲۶۔ وچند مقالات شرح مطالع سماعاً صفحہ ۲۶۴ ؎

؎ اتحاف النبلاء۔ صفحہ ۲۶۳۔

؎ تذکرہ اتحاف النبلاء صفحہ ۲۶۳۔ (مطبع نظامی ۱۲۸۸ھ)

اس پر مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں۔

ایک سال آٹھ مہینے کی مدت کا خیال کیجیے اور چھبیس[۲۶] کتابوں کے اس پشتارے کو ملاحظہ کیجیے آج کوئی باور کر سکتا ہے کہ نصاب نظامیہ کی یہ اعلیٰ سخت و دشوار کتابیں ایک شخص نے ڈیڑھ سال دو مہینے میں پوری کر لیں۔ بلا شبہ جماعت کی پابندیوں کے ساتھ اس کا تصور دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ لیکن جس قسم کی آزادی مفتی صاحب نے نواب صاحب کو عطا کی تھی اور خدا نے جیسی طبیعت ان کو ارزانی فرمائی تھی۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ جو بات سوچی نہیں جا سکتی ہے وہ وقوع پذیر ہوئی تھی[۱]۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب خود اپنی خود نوشت سوانح عمری۔
"ابقاء المنن بالقاء المحن"، میں بھی رقم طراز ہیں۔

"مفتی صاحب مرحوم سے علوم آلیہ ادب و منطق و حکمت و تفسیر و فقہ وغیرہ کو حاصل کیا۔ مفتی صاحب نے بعد تحصیل لطاقہ سند مرحمت فرمایا۔ سلسلۃ العسجد میں وہ سند منقول ہے۔

اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"میں یتیم پیدا ہوا۔ کوئی مرد گھر میں نہیں تھا جو مجھ کو تعلیم و تربیت کرتا۔ اللہ تعالے نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے شوق کتاب بینی اور علم کا دیا۔ سوا ورق گردانی اور ہر کتاب کے مطالعہ کے کوئی شغل لہو و لعب مجھ کو نہ تھا۔ نہ کسی کھیل تماشے کا شوق ذوق ہوا۔ یہاں تک کہ جب ذرا شدید ہو گئی تو علم صرف و نحو پڑھ کر واسطے طلب علم کے دہلی گیا اور وہاں کتب درسیہ کو مفتی صدر الدین خاں مرحوم پر دو برس میں عرض کر کے فارغ ہوا[۲]۔

---

[۱] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت صفحہ ۱۳ حصہ دوم [۲] ابقاء المنن صفحہ ۱۷ مطبع شاہجہانی بھوپال ۱۳۰۳ھ [۳] ابقاء المنن صفحہ ۸۹

نواب صاحب نے مفتی صاحب کے بطاقہ سند یا سارٹیفکٹ کو اپنی کتاب "اتحاف النبلاء" میں بھی نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"فقیر وقتی کہ در سنہ احدی و سبعین و مائتین والف (۱۲۷۱ھ) از خدمت ایشان جدا شدہ۔ بطاقہ سند۔ ثبت مہر باین عبارت لطف فرمودند"

"مولوی صدیق حسن صاحب ذہن سلیم و قوت حافظ و فہم درست و مناسبت تمام با کتاب و مطالعۂ صحیح و استعداد تمام دارند۔ جملہ کتب معقول رسمیہ از منطق و حکمت و از علم دین اکثر از بخاری و چیزی از تفسیر بیضاوی و فقہ و اصول و عقائد و کلام و عربیت از فقیر اکتساب نمودند و مستعدانہ و فہمیدہ خواندند۔ و با وجود آن بسعادت و رشد و صلاح و نیک نہادی و صفائی طینت و غربت و اہلیت و شرم و حیا در اقران و اماثل خود ممتاز اند"، [1]

مفتی صاحب قابل اور ہونہار شاگردوں کی تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کی صلاحیت اور استعداد کے مطابق ان سے برتاؤ کرتے ہمیشہ ان کی دل جوئی کرتے کثرت مشاغل کی بنا پر کبھی درس میں تاخیر ہو جاتی یا ناغہ ہو جاتا تو بہت افسوس کرتے۔

حکیم مولوی عبدالمجید خاں رامپوری مفتی صاحب بحالت طالب علمی ان کے کھانے کے کفیل تھے۔ سبق کے وقت کوئی صاحب مفتی صاحب سے ملنے آئے اس روز سبق ناغہ ہو گیا۔ دوسرے دن حکیم عبدالمجید خاں سبق کے وقت حاضر نہیں ہوئے۔ مولوی عالم مرادآبادی اور نواب قطب الدین خاں [2] ہم سبق تھے۔ مفتی صاحب نے دونوں کو بھیجا کہ دیکھو عبدالمجید خاں کا کیا حال ہے؟ جب دونوں صاحب ملے تو حکیم صاحب نے کہا کہ اب ارادہ پڑھنے کا نہیں ہے۔ مفتی صاحب کو ان کی ذہانت کی وجہ سے بے حد خیال تھا۔ آئندہ کے لیے مفتی صاحب نے وعدہ کر لیا سبق کے وقت کوئی اور کام نہ ہوگا۔ چناں چہ ولی عہد بھی تدریس

---

[1] اتحاف النبلاء صفحہ ۲۶۳

[2] نواب قطب الدین نہیں بلکہ سید قطب الدین دلاور علی جعفری ہوں گے مولف کو تسامح ہوا ہے۔

کے وقت آ جاتے تھے مگر مفتی صاحب جواب سلام کے سوا کوئی بات نہیں کرتے تھے۔[1]

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مفتی صاحب محکمۂ نزول کے کام میں اتنے مشغول ہوئے کہ درس کے لیے کوئی وقت نہ نکال سکے کئی دن تک درس بند رہا۔ طلبہ سخت پریشان ہوئے۔ آخر ایک منچلے شاگرد نے جرأت کر کے ایک نظم لکھی جس کے اس شعر سے اس واقعہ کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

ہاتف بہ درسِ چیپ سربتی فسردہ گفت
بیماری نزول بہ صدر الصدور شد

اس نظم کا یہ اثر ہوا کہ مفتی صاحب نے درس کا سلسلہ شروع کر دیا۔[2]

مدرسہ دار البقا کا قیام

عہدِ شاہجہانی کے مشہور مدرسہ دار البقاء کی عمارت شکستہ ہو گئی تھی۔ یہ مفتی صاحب کا بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے از سرِ نو تعمیر کرایا اور اس میں تعلیم و تعلم کا دوبارہ نظم و نسق قایم کیا۔ چناں چہ سر سید احمد خاں آثار الصنادید میں لکھتے ہیں اور آپ کی علم نوازی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"جامع مسجد کے جنوبی دروازہ کی طرف مدرسہ دار البقا ہے۔ اگلے زمانے میں اس میں طالب علم رہا کرتے تھے۔ اور معقول و منقول پڑھا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ بالکل خراب و برباد ہو گیا تھا۔ اور بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ زمانہ اہل اللہ سے خالی نہیں اور ہر وقت میں کوئی نہ کوئی صاحب ہمت عالی اور فطرت بلند ہوتا ہے اور یہ ہمت اور دل اور داد و دہش سوائے اس کے جس پر اللہ کا سایۂ رحمت ہو اور کسی کو میسر نہیں ہوتا۔ اس زمانے میں اللہ تعالےٰ نے جناب مولانا مولوی محمد صدر الدین خاں

---

[1] تذکرہ کاملان رام پور مولفہ احمد علی خاں شوق صفحہ ۲۴۴

[2] غدر کے چند علماء از مفتی انتظام اللہ شہابی ص ۲۶ و تاریخ المشاہیر از قاضی سلیمان منصور پوری ص ۲۰۴

بلند بہادر صدر الصدور شاہجہاں آباد کو ہمت اور فطرت ارجمند عنایت کی ہے۔ شاید اگلے زمانے میں کسی کو نہیں ہوگی۔ جناب ممدوح نے اپنی عالی ہمتی سے اس دار البقاء کو زر خطیر صرف کرا کر از سر نو مرتب کرایا ہے۔ اور شاہجہانی طور پر جو حجرے اس کے ٹوٹ گئے تھے۔ ان کو نئے سرے سے بنایا ہے اور مدرس نوکر ہیں اور طالب علم پڑھتے ہیں۔ ان کی خبر گیری نان و پارچہ کی ان کی سرکار عالی سے ہوتی ہے سبحان اللہ غور کرو کہ یہ چشمۂ فیض ہے کہ ان کی ذات فیض آیات سے جاری ہے۔ اور شجرہائے پربار دین کو پانی دیتا ہے۔ دنیا میں بجز نیک نامی کے کچھ نہیں رہتا ہے۔ اور عقبیٰ میں بجز اعمال کے اور کچھ نہیں جاتا ہے۔ یہ دونوں باتیں اللہ تعالےٰ نے انھیں کے لیے پیدا کی ہیں۔"[1]

اس مدرسہ میں طلبہ[2] کے جملہ اخراجات کے علاوہ مدرسین کی تقرری اور ان کی تنخواہ کی ذمہ داری بھی مفتی صاحب نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ اس مدرسہ کے مدرسین کے سلسلہ میں درج ذیل کے متعلق سرسید لکھتے ہیں۔

۱:" حاجی محمد صاحب ساکن ہیں نواح جونپور کے اور بعد ادائے حج بیت اللہ کے شہر شاہجہاں آباد میں وارد ہوئے اور مولانا محمد اسحق صاحب سے کتب حدیث کو تحصیل کیا۔ اگرچہ اور فنون سے بھی آگاہ ہیں۔ لیکن فن حدیث کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ ورع و تقویٰ میں مستثنیٰ ہیں۔ راقم نے جناب مستطاب مولانا مخدومنا مولوی محمد صدر الدین خاں بہادر کی خدمت میں ان کو حاضر ہوتے دیکھا اور ان کے جوہر

---

[1] آثار الصنادید مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۶ء ۔ چوتھا باب صفحہ ۱۱، ۱۲۔ اس کتاب کے ہر باب کے لیے الگ الگ نمبر ہے اور یہ قدیم نسخہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں موجود ہے

[2] نزہۃ الخواطر (صفحہ ۲۲۱، جلد ۷) میں ان وظیفہ خوار طلبہ کی تعداد ۲۵ دی ہے۔

سے مطلع ہوا۔ اس واسطے کہ حاجی صاحب مولانا موصوف کی طرف سے مدرسہ دار البقاء میں مدرس ہیں۔" [1]

۲۔ ملا سرفراز" یہ بھی بڑے مستعد شخص ہیں۔ کتب معقول و منقول و حکمت و ہندسہ و ہیئت بہت تحقیق سے پڑھاتے ہیں۔ حدیث و تفسیر جناب مولوی صدرالدین خاں صاحب بہادر سے پڑھی ہے اور اب جناب ممدوح کی طرف سے مدرسہ دارالبقاء میں مدرس ہیں۔ [2]

استاد العلماء مولانا مملوک علی نانوتوی بھی مدرسہ دارالبقاء میں پڑھاتے رہے۔ اور کچھ دنوں مولانا محمد قاسم نانوتوی کا بھی اس سے تعلق رہا۔ مفتی صاحب نے ہمیشہ جید اور ذی استعداد اساتذہ کی خدمات حاصل کیں۔ اور خود بھی اس میں درس دیتے رہے۔ یہ مدرسہ اپنے وقت میں نہایت نیک نام اور پورے ہندوستان میں اپنی تعلیم و تدریس و حسن و انتظام کے لحاظ سے ممتاز تھا۔

مولف خمخانۂ جاوید لکھتے ہیں کہ

"ان کے شاگردوں میں کئی شاگرد صاحب کمال اور نامور گزرے ہیں۔ آپ کے انتقال سے برسوں پہلے یہ بات زبان زدِ خاص و عام تھی کہ جس نے آپ سے فیض پایا اور مورد عنایات رہا۔ وہ ضرور اعلیٰ مدارج پر پہنچا۔" [3]

مرحوم دہلی کالج سے تعلق :۔ ہندوستان میں پہلی درسگاہ جس میں بلا لحاظ مذہب و ملت تعلیم کا مشترکہ نظم قائم کیا گیا وہ مرحوم دہلی کالج ہے۔ پہلے یہ غازی الدین خاں کا مدرسہ کہلاتا تھا۔ ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا۔ اس کالج کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور انگریزی کے

---

[1] آثار الصنادید چوتھا باب صفحہ ۷۲ [2] آثار الصنادید چوتھا باب صفحہ ۷۲

[3] خمخانہ جاوید لالہ سری رام جلد اول صفحہ ۵۲

مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ اور ہر مضمون کے لیے اس زمانے کے جید اور باصلاحیت
اساتذہ تعلیم دیتے تھے۔ اس کے نامور اساتذہ میں مولانا مملوک علی نانوتوی، مولوی
سبحان بخش، ماسٹر وزیر علی، ماسٹر امیر علی، مولانا امام بخش صہبائی۔ ماسٹر رام چندر
پنڈت رام کشن مولوی احمد علی، میر اشرف علی، ماسٹر حسینی، مولوی حسن علی
وغیرہ تھے۔

اس کالج کو اگرچہ انگریزوں نے قائم کیا مگر اس سے وسیع النظری اور
رواداری کی فضا قائم ہوئی۔ ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کے جذبات پروان چڑھے تحقیق اور
ریسرچ کا ذوق پیدا ہوا۔ علمی و ادبی بیداری پیدا ہوئی۔ اردو کے صاحب طرز ادیب
و نقاد اور چوٹی کے مصنف اور بلند پایہ شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ شمس العلماء محمد حسین آزاد
ڈپٹی نذیر احمد۔ مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی کریم الدین۔ ماسٹر پیارے لال اور ماسٹر
رام چندر وغیرہ اسی کے تعلیم یافتہ تھے۔

مفتی صدر الدین آزردہ اس کالج کے ایک اہم ممبر اور ممتحن تھے۔ اس کے تعلیمی
مشوروں اور کالج کی ترقی کے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ مولوی عبدالحق
لکھتے ہیں۔

"کالج کے انتظام کے لیے ایک مقامی مجلس تھی جو لوکل کمیٹی کہلاتی تھی۔ اس کا
فرض تھا کہ وہ کالج کے تمام معاملات کی نگرانی کرے اور اس کی بہبودی پر نظر رکھے۔ لیکن
اس کے اختیارات بہت محدود تھے۔ ہر انتظامی اور تعلیمی امر کے لیے گورنمنٹ یعنی لفٹنٹ
گورنر کی منظوری درکار ہوتی تھی لیکن مجلس کی رائے کی کالج کے معاملات میں گورنمنٹ
وقعت کرتی تھی۔ اکثر معاملات میں اس کی تجویز کے مطابق منظوری دی
جاتی کیوں کہ اس کے رکن معزز اور قابل لوگ ہوتے تھے۔ اور دلی
اور دلی والوں اور دلی کالج سے بہت زیادہ واقف تھے اور سکریٹری
تو کالج کا پرنسپل ہوتا تھا۔ مقامی مجلس کا ممبر کوئی بڑا سرکاری عہدہ دار ہوتا تھا
شروع شروع میں اس کے صدر دہلی کے ریذیڈنٹ کمشنر مسٹر سر ٹی، مٹکاف

تھے۔ اور ارکان مسٹر کالون جائنٹ مجسٹریٹ اور راس سول سرجن تھے۔ مجلس کے ارکان میں نواب حامد علی خاں شریک کیے گئے۔ مسٹر ٹیلر مجلس کے سکریٹری اور کالج کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔

سنہ ۱۸۴۲ء میں علاوہ مذکورہ بالا صاحبوں کے مسٹر سی۔ گرانٹ۔ نواب حسام الدین (جو دہلی کے امراء میں سے تھے) اور مولوی صدر الدین صدر امین اعلیٰ بھی مجلس کے ارکان مقرر کیے گئے۔"[1]

مفتی صاحب عربی فارسی کے امتحانات بھی لیا کرتے تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۴۵ء میں امتحان ہوا تو ریاضیات اور تاریخ کے پرچے گورنمنٹ نے مرتب کرا کر بھیجے۔ باقی پرچے کالج کے مدرسین نے تیار کیے۔ باقی جماعتوں کا امتحان اردو کے مولوی مملوک علی نے اور انگریزی کا قائم مقام پرنسپل نے لیا۔ مسعودی۔ تاریخ یمینی، قدوری، میر قطبی، حماسہ، حسینی کے پرچے گورنمنٹ نے بھیجے اور سنی اور شیعہ طلبہ کی اعلیٰ جماعتوں کو دیے گئے۔ ان کے تحریری جواب مفتی صدر الدین صاحب نے معائنہ کیے۔ عربی کی باقاعدہ جماعتوں کا امتحان مفتی صاحب ہی نے لیا۔ عربی جماعتوں کے پرچے ڈاکٹر اسپرنگر نے بھی دیکھے[2] فارسی جماعتوں کا امتحان بھی مفتی صاحب نے لیا۔ ان کی رائے میں ان جماعتوں کے طلبہ کی قابلیت نہایت عمدہ تھی۔

مفتی صاحب نہ صرف طلبہ کے امتحانات لیتے بلکہ انعامات و تمغے دیکر ان کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے۔ مٹکاف صاحب مر گئے تھے اس لیے کالج فنڈ سے ہر سال بیس روپے کا تمغہ تیار کرایا جاتا تھا اور انگریزی میں سب سے بہتر مضمون لکھنے والے کو ملتا تھا۔ اس سال یہ تمغہ بھگوان داس کو ملا۔ مفتی صدر الدین کا تمغہ اردو زبان میں بہترین مضمون لکھنے والے کو دیا جاتا تھا۔ وہ خواجہ ضیاء الدین

---

[1] مرحوم دہلی کالج صفحہ ۱۲۳۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو کراچی

[2] مرحوم دہلی کالج صفحہ ۵۲ و ۵۳

کو ملا۔ مضمون کا عنوان تھا: "شاہی اور مخلوط قسم کی حکومت میں کونسی بہتر ہے اور اس کی فضیلت کی کیا وجہ ہے؟" [1]

مفتی صاحب کے فیاضانہ سلوک اور طلبہ کی حوصلہ افزائی پر دہلی اردو اخبار نے ان کی تعریف میں لکھا ہے۔

"ہم نہایت درست اپنی تحقیق سے لکھتے ہیں کہ حقیقت میں ہمارے صدر الصدور صاحب کی ذات مجمع الصفات بھی نہایت ارفع ہے۔ یگانۂ روزگار ہے۔ اس حکومت اور ریاست و عظمت فضل اللہ ولی پر یہ حسن اخلاق اور پاس صفت وقار علمیت جو کہ نتیجہ کمال علم کا ہے۔ اس زمانے میں بہت کم ہے۔ ہمارے ہندوستانی صاحبوں میں ایسا جامع کمالات مفقود پایا جاتا ہے۔" [2]

کالج میں طلبہ کو وظائف بھی دیئے جاتے تھے۔ اس میں مقابلہ ہوتا اور کامیاب طلبہ وظیفہ کے مستحق گردانے جاتے۔ اس سلسلے میں مفتی صاحب سے بھی مشورہ لیا جاتا تھا۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔

"۱۸۴۹ء شعبہ مشرقی (عربی) میں سال گذشتہ کے وظیفہ خواروں کے علاوہ چار اعلیٰ وظیفہ پانے والے اور آٹھ ادنیٰ وظیفے والے تھے۔ جن میں ایک طالب علم نذیر احمد بھی تھا۔ (یعنی دلی کے مولوی نذیر احمد) ان کے سوا ۱۷ طلبہ کو چار چار روپے وظیفے دیئے جاتے تھے۔ شعبہ فارسی میں چار ادنیٰ وظیفہ پانے والے تھے جن میں ایک ذکاء اللہ بھی تھے سنسکرت شعبے میں ایک اعلیٰ وظیفہ پاتا تھا اور سات کو چار چار روپے کا وظیفہ ملتا تھا۔ اس سال ۶۲ بیرونی طلبہ عربی و فارسی کے وظیفے کے مقابلے کے لیے شریک امتحان ہوئے مفتی صدرالدین

---

[1] مرحوم دہلی کالج ص۵۳

[2] دہلی کالج اردو اخبار ۲۶ دسمبر ۱۸۵۳ء

صاحب نے امتحان لیا۔ ان میں سے ۶ وظیفے کے قابل نکلے"۔ [۱]

اساتذہ کی تقرری میں بھی مفتی صاحب کا مشورہ شامل رہتا۔ چنانچہ دلی کالج میں مولانا امام بخش صہبائی کے تقرر کا عجیب واقعہ نقل کیا گیا ہے جس کا حالی نے بھی "یادگار غالب" میں ذکر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔

"۱۸۴۰ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامسن لفٹننٹ گورنر مدرسے کے معائنے کے لیے آئے تو انھوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستند فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہیے۔ مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور نے عرض کی ہمارے شہر میں فارسی کے اُستاد صرف تین شخص ہیں۔ ایک مرزا نوشہ۔ دوسرے حکیم مومن خاں۔ تیسرے امام بخش صہبائی۔ لفٹننٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگے تھے۔ انھوں نے تو انکار کر دیا۔ مومن خاں نے یہ شرط پیش کی کہ سو روپے ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ انھوں نے یہ خدمت چالیس روپے ماہانہ کی قبول کر لی۔ بعد میں پچاس ہو گئے"۔ [۲]

اضافہ تنخواہ کے سلسلہ میں بھی مفتی صاحب کی رائے طلب کی جاتی تھی۔

"مسٹر ٹامسن وزیٹر دہلی کالج نے ۸۔ نومبر ۱۸۴۲ء کو ایک رپورٹ میں مولوی مملوک العلی کے اضافہ تنخواہ کی سفارش کی کہ ان کو اسّی روپے ماہوار ملنی چاہیے۔ بالآخر مولانا کو ساٹھ روپے تنخواہ ملنے لگی۔ اسی دوران میں نواب حامد علی خاں (متولی) نے مولوی جعفر علی کو سو روپے ماہوار پر کالج میں ملازم رکھ لیا اور کوشش یہ کی کہ ان کو صدر مدرس مقرر کر دیا جائے۔ مولانا مملوک العلی پندرہ سولہ سال سے کالج میں ملازم تھے۔ ان کی حق تلفی ہوتی تھی۔ کالج کے ارباب حل و عقد نے مفتی صدرالدین آزردہ سے اس مسئلہ میں رائے طلب کی انھوں نے مولانا مملوک العلی کے علم و فضل کو سراہا اور ان کی سفارش کی۔ مگر انتظامیہ نے

---

[۱] مرحوم دہلی کالج ص ۱۶۱

[۲] مرحوم دہلی کالج صفحہ ۱۱۱

نواب حامد علی خاں کے مقرر کردہ مولوی جعفر علی کو علاحدہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور معاملہ کچھ دنوں کے لیے ملتوی کردیا۔

بالآخر مولانا مملوک علی صدر مدرس قرار پائے اور سو روپے ماہوار ان کا مشاہرہ مقرر ہوا،، [1]

---

[1] رپورٹ جنرل کمیٹی ۱۸۴۱ء جنرل پروسیڈنگ جلد چہارم

باب ۳

فضل وکمال

مفتی صدر الدین آزردہ اپنے دور کے ان صاحبان فضل وکمال میں سے تھے جن کی علمی صلاحیت، ذہانت، معاملہ فہمی، ادبی بصیرت، ناقدانہ نظر اور شعر و شاعری میں اعلیٰ دستگاہ کا اعتراف معاصرین علماء کو بھی تھا اور شعراء کو بھی۔ انھوں نے اپنے گوناگوں اوصاف کا نقش سب کے دلوں میں بٹھا دیا تھا۔ ایک طرف بڑی بڑی علمی شخصیتیں ان کی خوبیوں کا ذکر کرتی ہیں تو دوسری طرف اس دور کے بلند پایہ شعراء نے بھی ان کی شان میں مدحیہ قصائد لکھے ہیں۔ سر سید احمد خاں اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں جہاں ان کا ذکر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شان میں نثر میں مدحیہ قصیدہ لکھ رہے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

هزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

قلم کو کیا طاقت کہ ان کے اوصاف حمیدہ سے ایک حرف لکھے اور زبان کو کیا یارا کہ ان کے محامد پسندیدہ سے ایک لفظ کہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس زبدۂ جہان و جہانیاں کی صفات کا احصاء محالات سے اور کمالات کا حصر مرتبۂ ممتنعات سے ہے۔ جس وقت قلم چاہتا ہے کہ کوئی صورت صفات میں سے لکھے یا زبان ارادہ کرتی ہے کہ کوئی مدح مدائح میں سے کہے چونکہ ہر صفت قابلیت اول لکھنے کی اور مدح لیاقت بیان کرنے کی رکھتی ہے مدت تک یہ عقیدہ بند زبان تحریر اور گرہ لسان تقریر رہتا ہے کہ کون سی صفت سے آغاز اور کون سی مدح سے ابتدا کرے۔

مجلس تمام گشت وبپایاں رسید عمر۔ ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم
بے شائبۂ تکلف و آمیزش مبالغہ ایسا فاضل اور ایسا کامل کہ جامع فنون شتیٰ مستجمع

علوم بے منتہا ہو۔ اب سوا اس گروہ علمارِ روزگار کے بساطِ علم پر جلوہ گر نہیں۔ ان حضرات کی طبع رسا شکل رابع سے پہلے اس سے نتیجہ حاصل کرتی ہے کہ بدیہی الانتاج ہے۔ اربابِ فہم و ذکا اور ناخن فکر عقدہ لاینحل کو پہلے اس سے وا کرتا ہے کہ گرہ حباب کو انگشت موج دریا۔ معنی فہمی اس درجہ کہ راست و درست سمجھ لیا کہ زبان سوسن نے کیا کہا اور رمز شناسی اس مرتبہ کی۔ واقعی معلوم ہوگیا کہ نگاہ نرگس نے کیا اشارہ کیا۔ اگر ان کا حدس صائب مصحف گل پر تصنیف نہ لکھتا، بلبل امی محض ہوتی۔ اور اگر ان کا فکر رسا سطر شمشاد کے معنی نہ بیان کرتا قمری سجع خواں نہ ہوتی۔ ان کی دقت طبع اور حدت فہم کے سامنے لالہ کے داغ اور سنبل کی پریشانی اور ارغوان کی جگر خوانی کی وجہ اسے مضمون پیش پا افتادہ ہے اگر ان کی رائے روشن منجر نہ ہو نقطہ موہوم کو اشارہ زنگت سے تقسیم کرے۔ اور جزو لایتجزی کو دو نیم۔ قلب المومن عرش اللہ۔ گویا انھیں کے دل کی شان میں ہے کہ حامل انفاس فیض اقتباس کے واسطے گوش بر آواز رہتا ہے۔ اولی مع اللہ ان پر علی الدوام صادق ہے۔ کیونکہ کوئی وقت ایسا نہیں کہ جبرئیل بارگاہ قرب الٰہی پر دیر تک اجازت کا منتظر رہے راہ حق میں تیز رو اور مسلک دنیا میں کاہل کوش۔ لیکن تونگری ظاہری درویشی معنوی کی پردہ پوش ہے۔

کسانیکہ راہ خدا داشتند
چنیں خرقہ زیر قبا داشتند

اگر مولوی جامی زندہ ہوتے یہ بیت

چو فقر اندر لباس شاہی آمد — بہ تدبیر عبید اللہی آمد

سوا اس الفنس و آفاق کے اور کسی کی شان میں نہ کہتے۔ چونکہ اربابِ معنی پر یہ بات ظاہر ہے کہ لباس فقر میں مصروف طاعت ہونا اور گوشہ خلوت کو واسطے فراغ عبادت کے اختیار کرنا موجب شہرت ہے۔ اور صیت بلند بسبب کثرت اہل دنیا کے اس شغل کے وہم سے باز رکھتی ہے۔ لباس ظاہر کو اختیار کیا اور بسبکہ اخفاق

حق اور فریاد رسی عباد اور عدل وانصاف افضل عبادات ہے۔ منصب صدارت کو اپنے ذمہ لیا۔ سبحان اللہ کیا طریقۂ داد ہے اور سرشتہ کیا انصاف ہے کہ نوشیرواں ان کے دیوان عدالت میں عہدہ پیشکاری کے لائق کبھی نہیں سمجھا جاتا۔ باقی رہا عدل عمرؓ یہاں بسبب ادب کے کچھ کہا نہیں جاتا۔ شوکت ظاہری سے ان کے دربار میں دارا کو گزر نہیں۔ اور جلالت باطنی سے ان کی خلوت میں فرشتے کو بار نہیں۔ باوجود ان مراتب بلند اور اس منصب ارجمند کے خلق محمدیؐ اختیار کیا ہے کہ افادہ علوم اور افاضت مسائل دین کے ہر وقت ہر ادنیٰ کو اجازت سخن ہے،،[1]

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے جب اپنا مشہور تذکرہ ،،گلشن بے خار،، لکھا تو مفتی آزردہ کا حال شامل نہیں کیا۔ اس کو دیکھ کر مرزا غالب نے شیفتہ کو لکھا۔

،،گہر سفتن خامہ دگو ہر ین رگشتن نامہ در ردیف الف نگارش اشعار پرورین نثار حضرت آزردہ از چہ است۔ ہر چند ذکر خدام برجیں مقام در جریدۂ ایں فن نہ سزاوار شان فضیلت باشد لیکن اگر بمقتضائے فرط محبت جرأتے بکار میرفت گناہے نہ بود و در تلافی آں بہ پوزش عذر نیاز حاجت نمی افتاد،،[2]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیفتہ نے آزردہ کا حال بڑھا کر نہ صرف یہ کمی پوری کر دی بلکہ کمال شناسی کا حق بھی ادا کر دیا۔ اس کے چند جملے ملاحظہ ہوں۔

،،دعویٰ ادراک علمش از جبل جباط ازل بایں خوبی قبائے قابلیت بر بالائے ندوختہ۔ و روشن گر قضا بایں روشن دلی و آگاہی آئینہ ضمیری نیفروختہ۔ بایں فضیلت شاعری از ایران سر نکشیدہ و بایں

---

[1] آثار الصنادید صفحہ ۴۲ تا ۴۴ مطبوعہ نول کشور ۱۸۷۶ء

[2] یادگار غالب صفحہ ۔۔۴ بحوالہ پنج آہنگ۔

عظمت ساحری از بابل نرسیدہ با خیال شرح کمالاتش طوطیٔ خامہ من بایں قدرت گفتار نغمہ سنج بے زبانی ست"[1]

نواب صدیق حسن خاں جنھوں نے دو سال تک ان سے فیض حاصل کیا اور ۱۲۷۱ھ میں ان سے رخصت ہوئے۔ انھیں "آخر فضلائے دہلی" قرار دیتے ہیں۔ ان کے تبحر علمی، حسن بیان، وجاہت و ریاست، قادر الکلامی و سخن فہمی اور مروت و اخلاق کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"در عصر خود یگانۂ روزگار و نادرہ عصر بود۔ ریاست درس و تدریس معقولات، بالخصوص افتائی ممالک محروسہ مغربیہ بلکہ مشرقیہ و شمالیہ دہلی و امتحان و مدارس و صدارت حکومت دیوانی بوی متعلق شدہ۔ در جمیع علوم از صرف و نحو و منطق و حکمت و ریاضیات و معانی و بیان و ادب و انشاء و فقہ و تفسیر و حدیث ید طولیٰ داشت و ہمہ علوم را درس میگفت۔ صاحب وجاہت و ریاست بود۔ نزد امراء و علماء و حکام و رعایای شہر جز بادشاہ دہلی ہیچکی از اعیان و اکابر بلدہ خاص و نواحی آن از رؤساء نبود کہ بمکان او نیامدے طلبۂ علم برائے اخذ علم و اہل دنیا برائے مشاورت معاملات و خوشاں برائے اصلاح انشاء و شعراء برائے مشاعرہ۔ دریں زماں بایں جمعیت و قوت حافظ و حسن تحریر و متانت تقریر و فصاحت بیان و بلاغت معانی با مروت و اخلاق و احسان دیدہ نشدہ۔"[2]

تقریباً یہی بات مولانا فقیر محمد جہلمی بھی اردو میں لکھتے ہیں۔

"تمام علوم صرف، نحو، منطق، حکمت، ریاضیات، معانی، بیان، ادب، انشاء

---

[1] گلشن بیخار صفحہ ۱۱

[2] اتحاف النبلاء صفحہ ۲۶۰

فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ درس دیتے تھے۔ آباؤ اجداد آپ کے کاشمیر کے اہل بیت علم و صلاح سے تھے۔ مگر آپ کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ علوم نقلیہ و فقہ و حدیث وغیرہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کے بھائیوں سے حاصل کیے اور ان کی سندیں لیں۔ اور فنون عقلیہ کو مولوی فضل امام خیرآبادی والد مولوی فضل حق سے اخذ کیا۔ اور شیخ محمد اسحٰق دہلوی نے بھی آپ کو حدیث کی اجازت لکھ دی۔ آپ بڑے صاحب وجاہت و سیادت اور اپنے زمانہ میں یگانۂ روزگار اور نادرہ عصر تھے۔ ریاست درس و تدریس خصوصاً افتائی ممالک محروسہ مغربیہ بلکہ مشرقیہ و شمالیہ دہلی اور امتحان مدارس و صدارت حکومت دیوانی کی آپ پر ہوئی۔ بجز شاہ دہلی کے تمام اعیان و اکابر امراء و علماء و فضلاء خاص دہلی اور اس کے نواح کے آپ کے مکان پر حاضر ہوتے تھے۔ طلبہ تو واسطے تحصیل علم اور اہل دنیا واسطے مشورت معاملات اور منشی لوگ۔ لغرض اصلاح انشاء اور شعراء واسطے مشاعرہ کے آتے تھے۔ اس آخر وقت میں ایسا فاضل بایں جمعیت و قوت حافظہ و حسن تحریر و متانت تقریر اور فصاحت اور بلاغت معانی کے صاحب مروت و اخلاق اور احسان نہیں دیکھا گیا۔" [1]

مولوی کریم الدین لکھتے ہیں۔

" آزردہ۔ گنجینۂ علم، کان حلم، بحر سخا، مخزن لطف و جود و عطا، لیہہ دوراں حسان ہندوستان، عامل کامل، فاضل اجل، فقیہہ بے مثل، عالم باعمل، مدح میں ان کی جو لکھوں سو کم ہے۔ کیوں کہ وہ ایسا ہی عالم ہے۔ ہر چند کہ مناسب نہیں کہ اس تذکرۂ شعرائے اردو میں جو کہ ان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا ان کا نام لکھوں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ بدون نام نامی اس کے یہ کتاب رونق نہ پاوے گی اور پسندیدۂ احباب نہ ہوگی۔ کیونکہ اس زمانے کے شعرائے اردو

---

[1] حدائق الحنفیہ۔ صفحہ ۴۸۱

گویوں میں وہ مثلِ شہنشاہ کے ہیں ،، ۱؎

مرزا قادر بخش صابر لکھتے ہیں۔

" حدیث و فقہ و تفسیر میں درجۂ اجتہاد ...... ہر چند نسبت شاعری سے ان کو ننگ و عار ہے لیکن شاعری کو ان کے ساتھ منسوب ہونا پایۂ اعتبار اور مایۂ افتخار ہے۔ اگر شعر اس سے بلند مرتبہ نہ ہوتا شعری نسبت شعر سے آسمان بریں تک نہ پہنچتا ،، ۲؎

نصر اللہ خاں خویشگی فرماتے ہیں۔

" خلعت صدر الصدوری دہلی بر قامتش زیباست ، بالائے والا ئیش صدر صدارت را زیب افزا۔ صاحب طبع فصیح و بہ نمک قابلیت ملیح۔ حق جل و علا وجود با وجود او را چشمہ فیض آفریدہ و عالمے از خوان احسانش مایدہ فایدہ برگزیدہ در فصاحت و بلاغت سحبان زبان۔ و در حکمت و معانی ارسطا طالیس دوران ، حاکمے باعدل و داد دست اور فضائل و محاسن شخصے ست بے مثل و آزاد اگر بصحبتش نہ رسیدہ ام فاما اوصاف گرامی او را از زبان عوام و خواص بسیار از بسیار شنیدہ ام ،، ۳؎

مولانا عبد الحئی نے " گل رعنا ،، میں لکھا ہے۔

" مفتی صدر الدین خاں بہادر عالی خاندان ، والا دودمان۔ سرمایۂ نازش ہندوستان ، فضل و کمال اور فنون ادبیہ کی بے نظیر قابلیت میں آپ اپنا جواب تھے سرزمین ہند میں جامعیت کے دو ہی چار ایسے شخص ہوئے ہوں گے۔ اس کے ساتھ مزاج

۱؎ تذکرہ شعرائے اردو صفحہ ۲۴۴

۲؎ گلستان سخن ص ۱۱۳

۳؎ گلشن ہمیشہ بہار ص ۵۳

دیکھو تو خلق مجسم اور لطف مصور۔ علم وکمال میں بقول شیفتہ "در فنونِ ادبیہ ثانیِ اعشیٰ و جریر است و در مراتب حکمیہ ثالث باقر و نصیر۔"[1]

لالہ سری رام صاحب اپنے تذکرہ خمخانۂ جاوید میں تحریر فرماتے ہیں۔

"عربی، فارسی، ریختہ۔ تینوں زبانوں پر قادر تھے۔ ہر ایک زبان میں بہا بہت فصاحت و بلاغت سے دادِ سخن دی ہے۔ جناب آزردہ مرحوم ان چند اشخاص میں سے تھے جنھوں نے اعلیٰ درجے کی جامع قابلیت و فضیلت کے باوجود ملک سخن میں بھی اپنی اعلیٰ استعداد کا سکہ بٹھایا ہے۔ آپ اپنے زمانے کے مشاہیر سے تھے۔ اور نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ منصب اعلیٰ پر ممتاز و حکام رس ہونے کے باوصف آپ کی طبیعت ظاہری نمائش سے کوسوں دور تھی۔ دنیوی آسایش کے تمام سامان بہم پہنچائے۔ مگر خود سیدھی سادی وضع سے بسر کرتے رہے۔ عدالتی کاروبار سے فرصت کے وقت طلبہ کا حلقہ آپ کے گرد رہتا تھا۔ طالب علموں کو بڑے شوق سے پڑھاتے تھے۔ علمی فیض کے علاوہ ضرورت مند کے ساتھ نقد و جنس سے مسلوک ہوتے تھے نہایت منصف، خوش مزاج، نیک نفس، نفاست پسند تھے۔ چنانچہ آپ کی نفاست پسندی کی اکثر حکایتیں مشہور ہیں۔ ان اوصاف کے ماسوا زندہ دل، خلق مجسم کہنا مبالغہ نہیں۔"[2]

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیر الدین مفتی صدر الدین آزردہ کے شاگرد تھے چنانچہ مولانا آزاد فرماتے ہیں۔

"والد مرحوم نے مفتی صاحب سے بھی تحصیل کی تھی۔ ان کے فضل و کمال و جامعیت کے بے حد معترف تھے۔ فرماتے تھے۔ ان کا سلوک مجھ سے ایسا تھا جیسا

---

[1] گل رعنا ص ۲۲۷

[2] خمخانۂ جاوید جلد اول صفحہ ۵۳

اپنے خاص عزیزوں سے ہوتا ہے ۔ عید کے دن ہمارے ہاں آتے تو جس طرح اپنے عزیزوں کو بطور عیدی کے کچھ دیا کرتے ہیں، ایک اشرفی میرے لیے بھی ضرور لاتے۔ نانا مرحوم فرماتے یہ اشرفیاں بطور تبرک رکھو۔

فضل وکمال علمی کے ساتھ ادب وشعر کا ذوق بھی تینوں زبانوں میں تھا۔ عربی، فارسی، اردو۔ تینوں زبانوں کے شاعر تھے۔ ان کا اردو کلام بہت تھوڑا ہے مگر جتنا ہے انتخاب ہے۔ اور پایہ بلند کے شایاں ہے ۔ والد مرحوم ایک مشاعرہ کا حال سناتے تھے جس میں ان کی غزل نے تمام اکابر کا رنگ پھیکا کر دیا تھا۔ " دور نہیں منظور نہیں "، مصرعہ طرح تھا ؎

دامن اس کا تو بہت دُور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار۔ گریباں تو مرا دُور نہیں

یہ شعر بھی جو ہمیشہ مری زبان پر رہتا ہے انھیں کا ہے ؎

کابل اس فرقۂ زہّاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

والد مرحوم اپنے چچا کا جنھوں نے مدینہ منورہ میں انتقال کیا ۔جب کبھی ذکر کرتے تھے تو مفتی صاحب کا یہ شعر ضرور پڑھتے تھے ۔

آزردہ مر کے کوچۂ جاناں میں رہ گئے
دی تھی دعا یہ کس نے کہ جنت میں گھر ملے

والد مرحوم فرماتے تھے کہ ادب عربی کا ذوق ان سے بڑھ کر میں نے وقت کے کسی فاضل میں نہیں پایا، حماسہ کے سینکڑوں اشعار نوک زبان تھے ۔ متنبی کا درس دہلی میں سب سے پہلے انھیں نے دیا ۔ "[1]

---

[1] غالب از غلام رسول مہر صفحہ ۲۸۲ نقش آزاد۔

باب

اہلِ کمال کی صحبتیں اور ادبی مجلسیں

مولانا حالیؔ "یادگارِ غالب" کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"تیرہویں صدی ہجری میں جب کہ مسلمانوں کا تنزل درجۂ غایت کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت، عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے، حسنِ اتفاق سے دار الخلافہ دہلی میں چند اہلِ کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہدِ اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتی تھیں اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں۔

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود
باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومنؔ و نیرؔ و صہبائیؔ و علویؔ وانگاہ
حسرتیؔ اشرفؔ و آزردہؔ بود اعظم شاں

اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی بار راقم کا دلی جانا ہوا، اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے۔ اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھے ہمیشہ فخر رہے گا، وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا۔ کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچہ بدل گیا۔ اور جس ہوا میں انھوں نے نشو و نما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی۔

زمانہ دگر گونہ آئیں نہاد   شد آں مرغ کو بیضہ زریں نہاد

---

[۱] یادگارِ غالب صفحہ ۲۱۰

مولانا عبدالحیٔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

"دلی اس وقت آج کی ایسی دلی نہ تھی۔ بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر مولوی امام بخش صہبائی۔ علامہ عبداللہ خاں علوی، مفتی صدرالدین خاں آزردہ۔ مرزا اسداللہ خاں غالب۔ نواب ضیاء الدین خاں۔ نیر رخشاں۔ شاہ نصیرالدین نصیر۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق۔ حکیم مومن خاں مومن۔ حکیم آغا جان عیش۔ حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان۔ میر حسین تسکین اور خدا جانے کتنے سخنوران باکمال کا جمگھٹا تھا۔ جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔ مفتی صدرالدین خاں اور خود نواب صاحب کے ہاں ہر ہفتہ باری سے مشاعرہ ہوتا تھا اہل کمال اس میں جمع ہو کر لطف سخن اٹھاتے تھے۔" [1]

دلی کی ان علمی و ادبی صحبتوں کی یاد جب سرسید احمد خاں کو آتی ہے تو بڑی حسرت سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔

دل بہلانے کے لیے اپنے باغ میں گیا جو ایک بہت بڑا باغ تھا اور جوانی اور ولولے کے زمانے میں میں نے اس کو از سر نو آراستہ کیا تھا۔ اور وہاں اکثر دوستوں کا اور بڑے بڑے نامی اور باکمال لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ غالب کی دلکش و محبت آمیز بزرگانہ باتوں سے، آزردہ کی دلچسپ و دلربا فصاحت سے، شیفتہ کی متین و نیم خندہ زن وضع سے۔ صہبائی جاں نواز کے میخانۂ محبت سے دل شاد رہتا تھا۔ [2]

مفتی صاحب کا دیوان خانہ: دلی میں عام طور سے اہل کمال تین جگہ اکٹھا ہوا کرتے تھے۔ ایک علامہ فضل حق خیرآبادی کے دولت کدہ پر۔ دوسرے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی کوٹھی پر۔ تیسرے مفتی صدرالدین آزردہ کے

---

[1] گل رعنا، ۲۲۷

[2] مقالات سرسید مرتبہ محمد عبداللہ خویشگی صفحہ ۳۲۳

دیوان خانے پر شاہی دربار سے یہ دربار کسی طرح کم نہ تھے۔ بادشاہوں نے لاکھوں روپے صرف کر کے نوادر جمع کیے تھے۔ ان شاہانِ علم نے اپنے حسن اخلاق سے سینکڑوں باکمال کو درباری بنا لیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے والد سے روایت بیان کرتے ہیں جسے غلام رسول مہر اپنی کتاب "غالب" میں نقل کرتے ہیں۔

"والد مرحوم (مولانا خیرالدین دہلوی) شب کی نشستوں میں جب کبھی اس عہد کا ذکر کرتے تو بار بار یہ شعر پڑھتے اور آبدیدہ ہو جاتے۔

تمتع من شمیم عرارِ نجدٍ فما بعد العشیۃ من عرار

فرماتے تھے کہ مفتی صاحب کا دیوان خانہ دہلی کے تمام منتخب افراد کا مرکز، جاڑا گرمی، برسات، کوئی موسم ہو لیکن شب کی یہ مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا تھا اگر کوئی نو وارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے اہل فضل وکمال کو بیک وقت اور بیک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانے کا رخ کرتا۔ اٹھارہویں صدی میں پیرس اور لندن کے علم دوست امراء کے سیلونز اور ڈرائنگ روم کے جو حالات ہم پڑھتے ہیں بعینہ یہی حال دہلی کے دیوان خانوں کی محفلوں کا بھی تھا۔ ہر حلقے میں کسی نہ کسی امیر کا دیوان خانہ شب کے اجتماع و سمر کا مرکز بن جاتا تھا۔ اور اس حلقے کے لیے ٹھیک ٹھیک ایک علمی، ادبی اور تفریحی کلب کا کام دیتا تھا۔ والد مرحوم ان دیوان خانوں کی مجلس کے جو افسانے سنایا کرتے تھے کاش وہ قلم بند کیے جا سکتے۔ بجھنے والے چراغ کا یہ آخری اجالا تھا۔ دہلی مرحوم کے ہفت صد سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کی یہ آخری بزم تھی۔ گو شان و شکوہ کے سارے پچھلے سارے نقوش مٹ چکے تھے، لیکن ان مٹے ہوئے رنگ و روغن میں بھی عہد ماضی کے مرقعوں کی بہار دیکھی جا سکتی تھی۔" [1]

---

[1] غالب از غلام رسول مہر صفحہ ۹۱ و نقش آزاد

مرزا فرحت اللہ بیگ اپنی عجیب و غریب تصنیف "دلی کی آخری شمع" میں لکھتے ہیں۔

"خیلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی بیگم[1] کے سامنے مفتی صدرالدین صاحب کا مکان تھا۔ اس کے نزدیک نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رہتے تھے...... مکان کوٹھی انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ صحن بہت بڑا نہیں ہے۔ اس میں مختصر سی نہر ہے۔ سامنے والا دردالان ہے اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں۔ دالانوں سے ملا ہوا اونچا صحن اور چبوترہ ہے۔ چبوترے کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے۔ ان پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے" [2]

---

[1] واقعات دار الحکومت میں مولوی بشیر الدین احمد لکھتے ہیں کہ جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے سامنے جو سڑک چلی گئی ہے وہ مٹیا محل کا بازار کہلاتا تھا۔ یہاں بجانب دست راست اس نام کا ایک محل تھا... بعد میں یہ محل نواب عزیز آبادی بیگم کو جو کسی شاہزادے کی بیگم تھیں دے دیا گیا۔ اور اسی سبب سے آگے چل کر وہ عزیز آبادی کی حویلی کہلانے لگا کیوں کہ مٹیا محل کے سامنے عزیز آبادی بیگم کی حویلی تھی۔ جو مدت تک نواب مغل بیگ خاں کے تصرف میں رہی۔ اس حویلی کے احاطے میں ایک شکستہ مسجد تھی جس کو مولوی صدرالدین خاں صاحب صدر الصدور نے بہ صرفِ کثیر درست کرا کے ایک کنواں بھی کھدوایا۔ یہ مسجد وسعت میں اچھی خاصی ہے جس کا ایک گنبد اور دو مینار ہیں لیکن اس مسجد کا کوئی خاص نام نہیں ہے۔ البتہ حویلی اور وہ احاطہ جس میں یہ حویلی ہے تاریخی لحاظ سے ایک بڑا اہم مقام ہے کیونکہ اس کے احاطے میں بعض پرانی عمارتوں کے کھنڈر ہیں اور لوگ انھیں کو مٹیا محل کا بچا کھچا حصہ بتلاتے ہیں۔ الغرض بہادر شاہ ثانی نے یہ حویلی اپنے کسی پوتے کو دیدی تھی غدر کے بعد تمام مکانات شاہی ضبط ہوئے اور فروخت کیے گئے تو نواب دوجانہ نے اس حویلی کو خرید لیا۔ اور مٹیا محل اور عزیز آبادی کی حویلی دونوں نام جا کر اب یہ احاطہ نواب صاحب دوجانے کے نام سے مشہور ہے۔ (واقعات دار الحکومت جلد دوم صفحہ ۱۸۹۔)

[2] دلی کی آخری شمع صفحہ ۲۹ و ۳۰

مولوی بشیر الدین احمد بھی لکھتے ہیں۔

"مٹیا محل سے سیدھے ہاتھ پر مولوی صدر الدین خاں کی حویلی ہے جو ان سے پہلے ہزارہ بیگ کی حویلی کہلاتی تھی۔ مولوی صاحب نے اسے خرید کر نئے سرے سے بنوایا ہے۔ یہ حویلی بہت خوش قطع ہے اور اس میں خانہ باغ۔ نہر فوارے سب کچھ تھا" ۱

حلیہ اور لباس :۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے مفتی صدر الدین آزردہ کا اس وقت کا حلیہ لکھا ہے جبکہ ان کی عمر ۶۵ سال کی تھی۔ لکھتے ہیں۔

"گداز جسم، سانولا رنگ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں بھری ہوئی ڈاڑھی۔ بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی ہیں۔ ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں، بدن میں ایک برکا انگرکھا۔ سفید پاجامہ سفید کرتا، اور سفید ہی عمامہ تھا"۔ (حاشیہ میں لکھتے ہیں)

"پرانے زمانے میں شرفاء گھر پر بھی پورا لباس پہنے رہتے تھے۔ زنانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے۔ ورنہ سارا وقت مردانے ہی میں گزرتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا تھا۔ عالم ہوتے تو درس کا حلقہ ہوتا۔ شاعر ہوتے تو شعر کا چرچا ہوتا۔ غرض کوئی وقت بیکار نہ گزرتا۔ خاص خاص دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوتی۔ ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت لیے دیے رہتے تھے۔ جہاں جا دیکھی معلوم ہوتا تھا کہ دربار لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دو زانو مؤدب بیٹھا ہے بے ضرورت نہ بات کی جاتی ہے نہ جواب دیا جاتا ہے کوئی ہنسی کی بات ہوئی ذرا مسکرا دیے۔ کھل کھلا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ بڑھ کر بولنا، اونچی آواز میں بات کرنا خلافِ ادب سمجھا جاتا تھا۔" ۲

---

۱ واقعات دار الحکومت جلد دوم صفحہ ۱۴۸

۲ دلی کی آخری شمع صفحہ ۳۹، ۴۰

شعر پڑھنے کا انداز : مرزا فرحت اللہ بیگ دلی کی آخری شمع یعنی دلی کے آخری یادگار مشاعرے میں لکھتے ہیں۔

مفتی صاحب کہتے تو خوب ہیں مگر پڑھتے اس طرح ہیں گویا طالب علموں کو سبق دے رہے ہیں۔ آواز ذرا نیچی ہے۔ لیکن ان کی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہوتا ہے۔ اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص شعروں اور بہت نیچی آواز میں۔ ہاں مرزا نوشہ ان سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں اور مزے مزے کی نوک جھونک بھی ہو جاتی ہے۔"[1]

لیکن مولانا فقیر محمد جہلمی ثم لاہوری آخری عمر میں مفتی آزردہ کے شاگرد ہوئے ہیں اور تیرہ ماہ تک رہ کر ان کی خدمت میں علوم عقلی و نقلی کا استفادہ کیا ہے فرماتے ہیں۔

"مولانا موصوف باوجودکہ چوہتر سال کے تھے۔ مگر ذوق شعر و سخن میں جوانان عاشق مزاج سے زیادہ مذاق رکھتے تھے۔ عربی فارسی اردو نہایت عمدہ کہتے تھے آزردہ تخلص تھا بمقتضائے اس کے ہمیشہ فرط عشق اور ولولہ محبت سے آزردہ خاطر افسردہ طبع، دیدہ گریاں، سینہ بریاں رہتے تھے۔ اور اشعار کے پڑھنے میں نہایت دل شگاف آواز اور لحن حزیں اور صورت درد انگیز رکھتے تھے۔ جس نے آپ کی زبان سے سخن موزوں سنا ہے وہی اس کیفیت کو جانتا ہے کیا انشاد شعر تھا یا ایجاد سحر۔"[2]

نواب صدیق حسن خاں نے مفتی صاحب سے فراغت حاصل کی تو مفتی صاحب تقریباً ۶۰ سال کے تھے۔ لیکن نواب صاحب مفتی صاحب کے انداز شعر خوانی اور ترنم کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

---

[1] دلی کی آخری شمع صفحہ ۸۹

[2] حدائق الحنفیہ صفحہ ۴۸۱

"در خواندن شعر سنجی دل شگاف و آواز حزین و صوتی بس درد انگیز داشتند ہر کہ سخنی موزوں از زبان ایشاں شنیدہ است وی میداند کہ چہ نمک داشت انشاد شعر بود یا ایجاد سحر"۔ [1]

شعر فہمی اور نکتہ سنجی : مولانا آزردہ شعر کا بہت صحیح مذاق رکھتے تھے۔ شعر کے حسن و قبح کی پرکھ بڑی اعلیٰ درجہ کی تھی۔ ان کے عہد میں اردو غزل اپنے شباب پر تھی نئے نئے خیالات اور معنی کی فکر عام تھی۔ ہر شاعر ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں تھا۔ جس شاعر کے کلام کو پسند کر لیا اور داد دی اس کی قدر بڑھ جاتی تھی حالی لکھتے ہیں۔

"ایک مرتبہ ان کے روبرو کسی نے غالبؔ کا یہ شعر پڑھا ؎

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

چونکہ مولانا نہایت صاف اور سریع الفہم اشعار کو پسند کرتے تھے۔ اس لیے مرزا کا کلام سن کر وجد کرنے لگے۔ اور متعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے؟ کہا گیا کہ مرزا غالبؔ کا۔ چونکہ وہ مرزا کے شعر کی کبھی تعریف نہیں کرتے تھے اور اس روز لاعلمی میں بے ساختہ ان کے منہ سے تعریف نکل گئی تھی۔ غالبؔ کا نام سن کر بطور مزاح کے جیسی کہ ان کی عادت تھی فرمایا "اس میں مرزا کی کیا تعریف ہے۔ یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے"۔ [2]

ایک روز منشی بہاری لال مشتاق اپنے دوست، لالہ رام چندر قمرؔ کے ساتھ جناب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور شعر و شاعری کا ذکر چلا۔ قمرؔ نے غالبؔ کی نکتہ سنجی اور نازک خیالی کی بہت تعریف کی۔ مولانا نے چیں بہ جبیں ہو کر فرمایا کہ

---

[1] اتحاف النبلاء صفحہ ۲۶۲

[2] یادگار غالب صفحہ ۱۶۱ و ۱۶۲

نہایت مشکل کہتا ہے اور پھر زانو پر ہاتھ مار کر شگفتہ جبیں ہوئے اور فرمایا کہ ہائے کہتا تو ایسا کہتا ہے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

جس زمانے میں میر نظام ممنون شاہ صاحب کے پرانے مدرسہ میں مشاعرہ کرتے تھے۔ ایک مشاعرہ میں مرزا نے اپنا فارسی قصیدہ "دریا گریستن اور تنہا گریستن" جو جناب سید الشہدا کی منقبت میں انھوں نے لکھا تھا، پڑھا۔ سنا ہے کہ مجلس مشاعرہ بزم عزا بن گئی تھی۔ جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ برابر روتے رہے۔ مفتی صدر الدین خاں مرحوم بھی موجود تھے۔ اتفاق سے اسی حالت میں مینہہ برسنے لگا۔ مفتی صاحب نے کہا۔ "آسمان ہم گریست"[۵۱]

میر کے دیوان میں ایک غزل ہے "خاک میں، چاک میں، ہلاک میں" مولانا آزردہ کے مکان پر ان کے چند احباب جن میں مومن اور شیفتہ بھی تھے ایک روز جمع تھے۔ میر کی اس غزل کا یہ شعر پڑھا گیا۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

شعر کی بے انتہا تعریف ہوئی اور سب کو یہ خیال ہوا کہ اس قافیے کو ہر شخص اپنے اپنے سلیقے اور فکر کے موافق باندھ کر دکھلائے۔ سب قلم اور کاغذ لے کر الگ الگ بیٹھ گئے۔ اور فکر کرنے لگے۔ اسی وقت ایک دوست وارد ہوئے۔ مولانا سے پوچھا کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں۔ مولانا نے کہا "قل ہو اللہ" کا جواب لکھ رہا ہوں۔" اس پر آگے چل کر حالی لکھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جوش جنوں میں گریباں یا دامن یا دونوں کو چاک کرنا ایک نہایت مبتذل اور پامال مضمون ہے۔ جس کو قدیم زمانے سے لوگ برابر باندھتے چلے آتے ہیں۔ ایسے جھیتڑے ہوئے مضمون کو میر نے باوجود غایت درجے کی سادگی کے ایک ایسے اچھوتے، نرالے اور دل کش اسلوب میں بیان کیا ہے کہ اس سے بہتر اسلوب تصور

---

[۵۱] یادگار غالب صفحہ ۶۳

ہیں نہیں آسکتا۔ اس اسلوب میں بڑی خوبی یہ ہے کہ سیدھا سادہ ہے نیچرل ہے اور باوجود اس کے بالکل انوکھا ہے"۔ [1]

میر کی نسبت آرزدہ کا یہ جملہ ان کی شاعری پر بڑا مکمل اور بھرپور تبصرہ ہے "پستش اگرچہ اندک پست است اما بلندش بسیار بلند"۔ [2]

ادبی چھیڑ چھاڑ:۔ دلی میں مشاعرہ تھا۔ مرزا نے اپنی فارسی غزل پڑھی۔ مفتی صدرالدین خاں صاحب اور مولوی امام بخش صہبائی جلسہ میں موجود تھے۔ مرزا صاحب نے جس وقت یہ مصرعہ پڑھا۔

بوادئی کہ دراں خضر را عصا خفت است

مولوی صہبائی کی تحریک سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ "عصا خفت است" میں کلام ہے۔ مرزا نے کہا کہ حضرت میں ہندی نژاد ہوں میرا عصا پکڑ لیا۔ اس شیرازی کا عصا نہ پکڑا گیا۔ ع

دلے بحمانۂ اول عصائے شیخ بخفت

انھوں نے کہا کہ "اصل محاورہ میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ مناسب مقام ہے یا نہیں"۔ [3]

۱۸۶۸ء کا وہ زمانہ تھا کہ نواب صاحب (شیفتہ) و مفتی صاحب کے یہاں ہر ہفتہ باری باری سے مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ایک روز نواب صاحب کے یہاں مشاعرہ تھا۔ اس میں مفتی صاحب نے اپنی وہ مشہور غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے۔

بانتنگ یہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا	یاں کے دکھادے دہن ایسا کمر ایسی

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۰۶ [2] گلشن بے خار

[3] آبحیات صفحہ ۵۲۶

نواب صاحب نے مزاحاً مفتی صاحب کے چھیڑنے کو اسی طرح میں ایک غزل ایسے شخص کو لکھ کر دے دی جس کا شمار سخنوران مشاہیر میں نہ تھا۔ مفتی صاحب کے بعد جس وقت اس نے غزل کو پڑھا مفتی صاحب کی گھبراہٹ اور پریشانی قابل دید تھی۔ اس غزل کے دو شعر یہ ہیں۔

ہم بزمئ دشمن کا چھپانا ہی تھا قاصد
کہتا ہے کسی سے کوئی ناداں خبر ایسی
کہتے ہو علاج آپ کریں کچھ خفقاں کا
دل کا ہے کو رہوے گا سنائی اگر ایسی[1]

حالی لکھتے ہیں۔

"مولانا آزردہ بے شک مرزا کی طرز خاص کو جو انھوں نے ابتداء میں اختیار کی تھی ناپسند کرتے تھے۔ اور جو خیال کہ ابتداء میں مرزا کی نسبت مولانا کی خاطر نشیں ہو گیا تھا وہ اخیر تک ان کے دل میں کسی نہ کسی قدر باقی رہا۔ چنانچہ مرزا نے جو ایک فارسی قصیدہ مولانا ممدوح کی شان میں لکھا ہے اس میں اس مضمون کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے کہ مولانا ان کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ قصیدے کی تمہید میں اپنے مصائب و آلام و شکایت روزگار وغیرہ کا بیان ہے۔ اس کے بعد مدح کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں۔

با چنیں اندوہ کہ پر گفتیم و دل خالی نہ شد
خواجہ گر اندوہ گسار من نبود ے وائے من
آنکہ در یکتائی وے در فن فرزانگی
متفق گردیدہ رائے بو علی با رائے من
آنکہ چوں خواہد بنا مش نامہ نامی ساختن
بر نگارد عقل فعالش کریم فرمائے من

---

[1] مقدمہ کلیات شیفتہ حسرتی مرتبہ نظامی بدایونی صفحہ ۳۲

دل بدیں وصفم نیاساید سخن کوتہ کنید
آنکہ ننگ اوست بودن در سخن ہمتائے من

یعنی بو علی سینا کا ممدوح کی یکتائی پر میرے ساتھ اتفاق رائے کرنا اور عقل فعّال کا اس کو "کرم فرمائے من" لکھنا، یہ سب باتیں اس کی مدح کے لیے کافی نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ ایسا شخص ہے کہ شعر میں مجھ جیسے شخص کا ہمسر و ہمتا ہونا بھی اس کے واسطے موجب ننگ و عار ہے۔ اس میں قطع نظر اس کے کہ ممدوح کی اور اس سے بھی زیادہ اپنی تعریف ایک نہایت لطیف پیرائے میں بیان کی ہے، اور اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ ممدوح میری شاعری کو پسند نہیں کرتا۔"

مرزا کی وفات سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسرتی کے مکان پر جبکہ راقم بھی وہاں موجود تھا، آزردہ اور غالب اور بعض اور مہمان جمع تھے۔ کھانے میں دیر تھی۔ فارسی دیوانِ غالب کے کچھ اوراق پڑے ہوئے مرزا کی نظر پڑ گئے ان میں ایک غزل تھی جس کے مقطع میں اپنے منکروں کی طرف خطاب کیا تھا۔ اور جس کا مطلع یہ ہے۔

نشاطِ معنویاں از شرابخانۂ تست
فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

مرزا نے وہ اوراق اٹھا لیے۔ اور مولانا آزردہ نے مزاح کے طور پر کہا۔ "دیکھیے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل لکھی ہے۔" یہ کہہ کر غزل پڑھنی شروع کی۔ اوّل کے دو تین شعروں کی مولانا نے تعریف کی۔ مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا ہی کا کلام ہے۔ مسکرا کر جیسی کہ ان کی عادت تھی کہنے لگے۔ "کلام مربوط ہے مگر کسی نو آموز کا کلام معلوم ہوتا ہے۔" سب حاضرین ہنس پڑے جب مقطع کی نوبت آئی کہ مرزا نے مولانا کی طرف خطاب کر کے دردناک آواز سے یہ مقطع پڑھا۔

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

اس وقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا آزردہ شرما کر خاموش ہو رہے"[1]

کلب علی خاں فائق رامپوری اپنی کتاب "مومن" میں لکھتے ہیں.

"آزردہ نے غالب کو طرز بیدل سے ہٹا کر اردو شاعری پر بڑا احسان کیا. اس لیے کہ جدید اردو شاعری کی تحریک ممنون نے چلائی اور آزردہ نے اس کی حمایت میں پوری مساعی حسنہ سے کام لے کر ایک نیا جوڑ اردو شاعری میں پیدا کیا"[2]

حالی کی رائے ہے کہ آزردہ سادہ روش کو پسند کرتے تھے اور اسی لیے معاصرین نے آزردہ کی ہمنوائی کی.

یوسف سلیم چشتی کہتے ہیں کہ

"غالب بہت ذہین الشان تھے. اس لیے ہمیشہ اپنے فنی نقائص اور عیوب کی اصلاح کرتے رہے. یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ مولانا فضل حق خیر آبادی مرحوم اور مفتی صدرالدین آزردہ مرحوم کے مشوروں پر عمل کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ان کے کلام میں وہ خوبیاں پیدا ہو گئیں جن کی بدولت وہ غالب بن گئے."[3]

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۲۲ - ۱۳۱ -

[2] مومن، مصنفہ کلب علی خاں فائق رامپوری صفحہ 216 شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور

[3] مقدمہ شرح دیوان غالب صفحہ ۸۷

باب ۵

معاصرین سے تعلقات

غالب اور آزردہ کی دوستی: باوجود اختلاف رائے اور ذوق کے غالب اور آزردہ ایک دوسرے کے قلبی دوست اور قدرداں تھے۔ ایک دوسرے کی عزت و محبت کا دم بھرتے تھے۔ غالب عبدالرزاق شاکر کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"حسن اتفاق سے اصلاح خمسہ کے وقت دوست غمگسار، یار وفا شعار علامۂ روزگار ختم العلماء المتبحرین مولوی صدرالدین خاں صاحب بہادر صدرالصدور دہلی المتخلص بہ آزردہ دام بقائہ وزاد علائہ کہ مجھ سے ملنے کو غم خانہ پر تشریف لائے ہوئے موجود تھے۔ خمسہ کو دیکھ کر پسند فرمایا۔ حضور کی بلاغت کی تحسین عربی مصرعوں کے میرے ساتھ شریک غالب ہو کر مزے لوٹے اور آپ کی شیرینیٔ گفتار کے وصف میں نادیدہ عذب البیان و رطب اللسان رہے۔ اور مجھ سے بقدر میرے معلوم و بیان کے آپ کی صفات حمیدہ سے واقف و آگاہ ہو کر بہت شاد و خرسند ہوئے۔ مبارک ہو نادیدہ غائبانہ یعنی محض مشتاقانہ بہ تمنائے ملاقات عجز و نیاز لکھنے کو ارشاد کر گئے ہیں۔ لہذا میں لکھتا ہوں قبول فرمایئے گا۔" [۱]

مولانا آزردہ نے "ددر نہیں۔ حور نہیں" اس زمین میں غزل لکھی تھی۔ اس میں اتفاق سے مطلع بہت اچھا نکل آیا تھا۔ مولانا نے اپنی غزل دوستوں کو سنا کر ان

---

[۱] عود ہندی صفحہ ۲۶۲

سے کہا کہ اگرچہ بحر دوسری ہے۔ مگر اسی ردیف و قافیہ میں نظیری کی بھی ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

عشق عصیاں است اگر مستور نیست
کشتۂ جرم زباں مغفور نیست

ظاہر ہے کہ اگر نظیری ہندی نژاد ہوتا اور اسی زمین میں جس میں ہماری غزل ہے اردو غزل لکھتا تو اس کا مطلع اس طرح ہوتا ؎

عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں
کشتۂ جرم زباں ناجی و مغفور نہیں

آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور بغیر اس کے کہ قائل کا نام لیا جائے اپنا مطلع اور نظیری کے مطلع کا یہی اردو ترجمہ (جو اوپر مذکور ہوا) مرزا کو سنائیں۔ اور پوچھیں کہ کون سا مطلع اچھا ہے۔ چونکہ نظیری کا مطلع اردو ترجمہ سے بہت پست ہو گیا تھا سب کو یقین تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کریں گے اور مولانا آزردہ کے مطلع کو ترجیح دیں گے۔ چنانچہ مولانا اور نواب صاحب (شیفتہ) اور بعض احباب مرزا کے ہاں پہنچے۔ معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا کہ اردو کے دو مطلع ہیں۔ ان میں آپ محاکمہ کیجیے کہ کون مطلع اچھا ہے اور بطور ربیتین کے اوّل نظیری کے مطلع کا یہی اردو ترجمہ پڑھا۔ ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اس مطلع کو سن کر سر دھننے لگے اور متحیر ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا؟ اور اس قدر تعریف کی کہ مولانا آزردہ کو یہ امید نہ رہی کہ اس سے زیادہ میرے مطلع کی داد ملے گی۔ چنانچہ انھوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا۔ اور سب لوگ نہایت تعجب کرتے ہوئے وہاں سے اٹھے۔ [1]

آزردہ اور غالب میں اگر چند روز بھی ملاقات نہ ہوتی تو بے چین رہتے۔ غالب

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۶۹ و ۷۰

آزاد مزاج اور آزردہ عالم دین اور بڑی حد تک مذہبی دائرے میں زندگی بسر کرنے والے، لیکن رمضان کے مہینے میں بھی ملنے کے لیے غالب کے مکان پر پہنچ جاتے اس سلسلے میں ان کا لطیفہ مشہور ہے۔ حالی لکھتے ہیں۔

"ایک دن جب کہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا۔ مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اس وقت مرزا صاحب اس کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے۔ اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھکر کہنے لگے کہ ہم نے حدیث میں پڑھا تھا۔ کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے۔ مگر آج اور اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا۔

مرزا نے کہا۔ "قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری تو ہے۔" [۱]

اردوے خط میں کوئی خط غالب کا آزردہ کے نام نہیں ملتا لیکن "پنج آہنگ" میں فارسی میں چند خط آزردہ کے نام بھی ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا غالب نے آزردہ کی شان میں بڑا شاندار فارسی قصیدہ لکھا ہے جس میں کل ۷۱ اشعار ہیں بخوف طوالت اس میں سے صرف چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔

صدر دین و دولت و صدر الصدور روزگار
میر و مخدوم و مطاع و والی و مولائی من

گویم واز نکتہ چیناں در دلم نبود ہراس
کیقباد و قیصر و کیخسرو دارای من

مو کبش چون مرجع عام است با غیرم چہ بحث

---

[۱] یادگار غالب صفحہ ۲۷

پر سشے دارد ارسطو میدود ہیپا ی من

عاجزم چوں در ثنا ئی دوست بارشکم چہ کار

میروم از خویش تا گیرد عطار دجا ئی من

خاک کوکیش خود پسند افتادہ درجذب سجود

سجدہ از بہر حرم نگزاشت درسیمای من

صاحبا از یمن فیض روشنا سیہا ی تست

روشناس چرخ و انجم پایۂ والا ئی من

برسر کو ئی تو از اندازہ بیروں می رود

التماس روشنانِ چرخ و استغنا ئی من

تیر ہیشم درجبیں سا ئی کہ سوزم عرصہ دار

تا چہ آتش می فروزد مہر درجوزا ئی من

مشتری با من بیوزش کا ی بہ معنی ہمنشیں

بگزارنی از نظر قرطاس استغنا ئی من

من بمدح خواجہ دستاں سنج و دل مست سماع

نی غلط گفتم نہ دل فرزانۂ یکتا ئی من

دوش در بزمی کہ ناہید از صفا ئی آں بساط

گفت دستم گیرمی ترسم کہ لغزد پا ئی من

اند ڈرد آشام غالب نام در ساقی گری

پارہ مشک و گلاب افزود در صہبا ئی من

غالب بلا شبہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے شاعر تھے اور اپنے تمام معاصرین پر فوقیت رکھتے تھے۔ لیکن ایک ذہین اور جینیس آدمی کے لیے بگڑنے کا بھی بڑا خطرہ رہتا ہے۔ اگر ان کے صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک ، نکتہ چینی

خردہ گیری اور طعن و تعریض سدّراہ نہ ہوئی تو وہ شدہ شدہ منزلِ مقصود سے بہت دور جا پڑتے۔ اس سلسلے میں مولانا آزردہ اور مولانا فضلِ حق کا وجود غالب کے حق میں بڑا مفید ثابت ہوا۔ دونوں نے اپنے عزیز دوست کی صلاح کو دیکھ کر ان کے حق میں ایسے مفید مشورے دیے۔ جس نے آگے چل کر ان کی عظمت میں چار چاند لگا دیے۔ اور غالب کو غالب بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔

حالی نے لکھا ہے۔

"حسنِ اتفاق سے اس اخیر دور میں چند صاحبانِ فضل و کمال دارالخلافہ دہلی میں ایسے پیدا ہو گئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے۔ ان چند صاحبوں سے میری مراد مولانا فضل حق خیرآبادی ثم دہلوی، مولانا محمد صدر الدین خاں المتخلص بہ آزردہ۔ مولوی عبد اللہ خاں علوی، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن۔ نواب مصطفےٰ خاں حسرتی، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں، سید غلام علی خاں وحشت وغیرہم ہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کا مرزا کے عصر میں موجود ہونا ان کی شاعری کے حق میں بعینہٖ ایسا تھا جیسا عرفی و نظیری کے حق میں خانخاناں، ابوالفتح، فیضی، اور ابوالفضل کا ان کے زمانے میں ہونا"۔ [1]

اپنے معاصرین میں آزردہ

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ و حسرتی سے رسم اتحاد:-

گو سب سے زیادہ اخلاص و اتحاد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے تھا۔ دونوں بزرگوں کے دولت خانوں میں بھی زیادہ دوری نہ تھی۔ اس لیے باہم آمد و شد رہتی تھی۔ شیفتہ "گلشنِ بے خار" میں لکھتے ہیں۔

"راقم کے ساتھ نہایت الفت رکھتے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ان کی صحبت سے باریاب نہ ہوتا ہوں۔ اور اس قدر مکرر کے باوجود بھی روح کا تازہ حلاوت اندوز نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک ان کی مجالست کے بغیر جو دن گزر جائے وہ داخل ایام عمر نہیں ہے۔ خلق مجسم ہیں"۔ [2]

---

[1] یادگار غالب ص ۲۱۸، [2] گلشن بے خار صفحہ ۱۲

نواب صاحب نے حج کا سفر اختیار کیا۔ سفر میں بھی آزردہ کی یاد آتی رہی حج سے واپس ہو کر جب وارد بمبئی ہوئے تو آزردہ کے خط کے جواب میں ایک قطعہ فارسی بیس شعر کا لکھا تھا۔ جس میں نہایت والہانہ انداز میں اپنی دوستی والفت کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اے فرض احترام تو از کعبہ سوی ہند
دانی کہ بازگشت چرا کردہ ایم ما

زان مشرق لوائح قدس از چہ روی باز
اندیشہ صرف نیّر ہرا کردہ ایم ما

بہر طواف کوی تو اے مہر اوج فضل
رو جانب زمین ز سما کردہ ایم ما

اے حج و عمرہ از تو دانیم رکن و شرط
زین راہ طے مرحلہا کردہ ایم ما

اے آگہ از تفنن الفت چہ دور اگر
از قبلہ رو بقبلہ نما کردہ ایم ما

شیخ الرئیس را تو ہمسر نوشتہ ایم
پرسی اگر صواب خطا کردہ ایم ما

پور قباد را تو ہمپایہ گفتہ ایم
انصاف میدہیم جفا کردہ ایم ما

آن مظہر شئون صفاتی کہ اکتساب
از شیوۂ تو رسم وفا کردہ ایم ما

آنی کہ دل بشیوۂ شیرین ربودۂ
آنے کہ جان بذوق خدا کردہ ایم ما

مراۃ دل بہجر چو زنگ الم گرفت
از یاد عارض تو جلاد کردہ ایم ما

زاں پارہ آتشی کہ دلش مجمر آمدہ
آتش عنبار و آب ہوا کردہ ایم ما

بر ما مگیر نامہ اگر کم نوشتہ ایم
دانی کہ اعتماد صبا کردہ ایم ما

در نامہ ناشتن تو از پیش خود
صد گونہ عذرہا بسزا کردہ ایم ما

دیں نامہ اگرچہ بعد دو سال نوشتہ ایم
اما ہزار ناز بجا کردہ ایم ما

ہم در طواف کعبہ ترا یاد کردہ ایم
ہم آرزوی تو بمنا کردہ ایم ما

در کعبہ داستان مدیح تو خواندہ ایم
و در مدینہ بر تو ثنا کردہ ایم ما

ہم بہر تو بمردہ تمنا نمودہ ایم
ہم بر صفا دعا بصفا کردہ ایم ما

ہر جائی کان محل اجابت شمردہ ایم
حق وفا و مہر ادا کردہ ایم ما

در ختم نامہ عرض دعا گر نکردہ ایم
اے حسرتی حذر ز ریا کردہ ایم ما

دانگہ دعا بموضع دیگر چہ حاجت است   چوں بارہا بکعبہ دعا کردہ ایم ما[۱]

ان کے علاوہ کلیات شیفتہ و حسرتی کے اندر رقعات کے حصہ میں تقریباً سات خطوط آزردہ کے نام بھی ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ ہر خط ادب و انشاء کا اعلےٰ نمونہ ہے، بلکہ اس میں محبت و عقیدت، اخلاص و مودت کے جذبات سطر سطر میں نمایاں ہیں۔ اسی میں ایک خط ایسا بھی ہے جس میں شیفتہ نے آزردہ کے صاحبزادے کی ناگہانی وفات پر دلی رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔

غدر کے وقت جب گرفتاری ہوئی تو آزردہ نے ایک "شہر آشوب" لکھا اس میں فرماتے ہیں

ٹکڑے ہوتا ہے جگر جان پہ بن آتی ہے   مصطفےٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

نظامی بدایونی لکھتے ہیں کہ

"مفتی صاحب نواب صاحب کے انتقال کے بعد جتنے تک زندہ رہے جب کبھی نواب محمد علی خاں یا نواب محمد اسحاق خاں صاحب فرزندان نواب صاحب مرحوم سے ملاقات ہو جاتی تو نواب صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی" اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔" [۲]

شیفتہ کی وفات کا آزردہ پر اتنا اثر رہا کہ فرماتے ہیں؎

رہے ہم نہ کچھ مصطفےٰ خاں کے غم میں   نہ فکر سخن نے پڑھانے کے قابل

نواب شیفتہ کی کتاب تذکرہ گلشن بے خار ۱۲۵۲ھ میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس پر ایک تقریظ مفتی صدرالدین آزردہ کی لکھی ہے اس کا اقتباس

---

[۱] شمع انجمن صفحہ ۳۵ و ۳۶ مصنفہ نواب صدیق حسن خاں رئیس المطابع شاہجہانی بھوپال [۲] کلیات شیفتہ و حسرتی مرتبہ نظامی بدایونی صفحہ ۳۰

ملاحظہ ہو۔

"و چگونہ چنیں نہ باشد کہ فراہم آوردہ سرآمد سخنوران معنی گستر انتخاب مجموعہ کمال و ہنر، شاہ بیت سفینہ قابلیت و استعداد بیت القصیدہ دیوان فضل و کمال خداداد، فاتحہ صحیفہ کاملہ دولت و اقبال، بسملہ نسخہ جامعہ محاسن شیم و مکارم خصال، سواد خوان رموز و اسرار و سواد و بیاض گزین فیض یافتگان مبدا فیاض، نسیم جانفزائے گلشن سخن طرازی، شمیم نافہ کشائی گلہائے چمن، نکتہ پردازی، والا فطرت، بلند ہمت، پاک نہاد نیکو روش، قدسی نژاد، صفوۃ منش، پاکیزہ طینت، روشن ضمیر کامل فرہنگ، عدیم النظیر، فہم مجسم، ادراک مشکل نواب مصطفےٰ خاں بہادر متخلص بہ شیفتہ است، لآلی منثور سخن طرازاں را از نظم او پایہ بلند است و رباحین منثور نکتہ پردازاں را از فراہمی او پایہ ارجمند۔"

سر سید اور آزردہ:- بعض تذکرہ نگاروں نے سر سید احمد خاں کو مفتی صدر الدین آزردہ کا شاگرد لکھا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ ان کے باقاعدہ شاگرد نہ تھے۔ بلکہ آزردہ کی شخصیت سے متاثر اور ان کے عقیدت مندوں میں تھے۔ انھوں نے درسیات کی کتابیں زیادہ تر مولوی نوازش علی خاں سے پڑھیں، مگر آزردہ سے کبھی کبھی استفادہ علمی کیا ہے۔ اکثر ان کی خدمت میں جاتے اور مستفید ہوتے۔

مولانا حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں۔

جب انھوں نے پڑھنا چھوڑا ہے۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔ اس کے بعد بطور خود کتابوں کے مطالعے کا برابر شوق رہا۔ اور دلی

ہیں جو اہل علم اور فارسی دانی ہیں نام آور تھے جیسے صہبائیؔ، غالبؔ، آزردہ وغیرہ ان سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔“ [۱]

اسی طرح جہاں انھوں نے دلی کے فارسی دانوں کا ذکر کیا ہے تو لکھتے ہیں۔

”مولانا صہبائیؔ سے ان کی دوستی اخوت کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔ مولانا سے جو طالب علم مکان پر فارسی پڑھنے آتے تھے ابتدا میں وہ سرسید ہی کے مکان پر ان کو تعلیم دیا کرتے مفتی صدرالدین خاں کے ہاں بھی ایک پھیرا ہر روز ہوتا تھا۔ جہاں صہبائیؔ اور شیفتہ اور مومن وغیرہ کا مجمع رہتا تھا۔ مرزا غالب کو وہ چچا کہتے تھے۔ اور مرزا ان پر بزرگانہ شفقت کی نظر رکھتے تھے۔ نواب ضیاءُ الدین خاں ان کے نہایت گاڑھے دوست تھے۔ اور یہ سب لوگ فارسی نظم و نثر میں کمال رکھتے تھے۔“ [۲]

مفتی سعداللہ جو سرسید کے مخالفوں میں تھے ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

”جس زمانے میں سرسید کی آمد و رفت مفتی صدرالدین خاں مرحوم دہلوی کے مکان پر بہت زیادہ تھی۔ غالباً اسی زمانہ میں مفتی سعداللہ صاحب بطور طالب علموں کے دلی میں وارد تھے اور مفتی صدرالدین صاحب سے پڑھتے تھے۔“ [۳]

ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید کو آزردہ سے دلی لگاؤ تھا۔ اور اسی دلی لگاؤ کا اثر تھا کہ سرسید کے بڑے بھائی جن سے سرسید کو بے حد محبت تھی یعنی سید محمد خاں نے ۱۸۴۵ء میں جب انتقال کیا تو مفتی صدرالدین خاں نے جو سرسید کو ان کی تعزیت کا خط بھیجا تھا اس میں یہ شعر لکھا تھا۔

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت | مرگے کہ زندگان بہ دعا آرزو کنند [۴]

---

[۱] حیات جاوید پہلا باب صفحہ ۳۴

[۲] حیات جاوید حصہ دوم صفحہ ۲۸۵

[۳] حیات جاوید پہلا باب صـ

[۴] حیات جاوید حصہ دوم صفحہ ۵۴۴

سرسید نے جب اپنی مشہور کتاب "آثار الصنادید" لکھی تو مفتی صدر الدین آزردہ نے منظوم تقریظ لکھی جس میں کُل ۵۱ اشعار ہیں۔ چند اشعار یہ ہیں۔

کہ آں را رقم کرد بحر کمال — فرد ہمیدہ فرہنگ فرخ خصال
نکردہ فزوں رتبہ اش منصفی — کہ بوداست دوں رتبہ اش منصفی
ز بیند اگر خامہ از رائے او — شود نخل ایمن سراپائے او
رسا فہمش اندیشہ او سلیم — خیالش مداوائے طبع سقیم
ستارہ النس او در دلم جائے گیر — بد اندیش را گو ز حسرت بمیر
ببیں میوۂ باغ ہستی دلش — پرستارۂ حق پرستی دلش
نو آئین او بہر ارباب فن — طرب بخش ہمچوں شراب کہن
بجیب صفا خلق او نافہ بار — کہیں حلقہ در گوش آمد بہار
دل او ز آئینہ شفاف تر — بصافی ز آب گہر صاف تر
صفا خیزد از جوہر سینہ اش — زمہ رو نما خواہد آئینہ اش
ضمیرش بدرک در رسائی علم — ذکا را بلمعان فکرش قسم
محال است کاں را کسی رد کند — قبولش اگر سید احمد کند

غدر کے بعد جب وہاں کے مسلمان بالکل مٹ گئے اور دلی ایک قالب بے روح ہو گئی۔ اب اسی حب وطن کا یہ تقاضہ ہوا کہ جن آنکھوں سے اس کی بہار دیکھی تھی انھیں آنکھوں سے اس کی خزاں کیونکر دیکھی جائے۔ گو بظاہر سرسید نے دلی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی تھی، مگر آدم کو بہشت چھوڑنے کا اتنا ہی افسوس ہو گا جتنا کہ سرسید کو دہلی چھوڑنے کا افسوس تھا۔ ان کے آرٹیکلوں میں، اسپیچوں میں، اور لکچروں یا پرائیوٹ خطوں میں جہاں کہیں دہلی کا ذکر آگیا ہے، ان کا دل اڑے بغیر نہیں رہا۔ وہ اپنی کتاب "راہ سنت" پر ریمارک کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"یہ باتیں تو ان صحبتوں کی یادگار ہیں جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں. کجا وہ صحبتیں، کجا وہ مجلسیں، کہاں وہ آزردہ، کہاں وہ شیفتہ اور کہاں وہ صہبائی، کہاں وہ علماء و صلحاء صرف یاد ہی یاد ہے"، [1]

قرآن و حدیث کے فہم اور فقہی مسائل کی تحقیق

رواداری اور عالی ظرفی :- و تنقید میں اختلاف کوئی نئی بات نہیں ہے صدر اول سے مختلف مکاتیب فکر اور مختلف فقہی مسلک رہے ہیں. دہلی کے عوام و خواص بھی اس زمانے میں دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے. ان میں کبھی بحث و مناظرہ بھی ہو جاتے تھے. ایک گروہ کٹر حنفی مسلک کا پیرو تھا. دوسرا عاملین با لحدیث کا حضرت شاہ عبدالعزیز اور ان کے بھائیوں کا مسلک تو حنفی تھا. مگر اسی خاندان میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہید و مولانا عبدالحیٔ اور حضرت سید احمد شہید کے بعض خلفا اور ماننے والوں کا مسلک اہل حدیث تھا. مفتی صدر الدین خاں آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی ان سے اختلاف رکھتے تھے. لیکن باوجود اختلاف کے نہ انھوں نے ان کی تکفیر کی اور نہ گمراہ قرار دیا. ہمیشہ احترام و عزت کے ساتھ ان بزرگوں کو یاد کرتے رہے. نواب صدیق حسن خاں جو خود عاملین با لحدیث میں ہیں ماآزردہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

> " باوجود تعصب مذہب انصاف دوست بود. بارہا از زبانش ثنا و صفت مولانا محمد اسمٰعیل شہید و مولوی محمد اسحٰق دہلوی نزیل مکہ مکرمہ شنیدہ شد،، [2]

تقویۃ الایمان کے خلاف جب ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور بہت سے علماء نے

---

[1] حیات جاوید حصہ دوم صفحہ ۹۰۔۴

[2] اتحاف النبلاء صفحہ ۲۶۰

مولانا اسمٰعیل شہید کی تکفیر کی تو اس سلسلے میں مفتی صاحب سے بھی استفسار کیا گیا۔ اس کے جواب میں مفتی صاحب نے لکھا۔

تقویۃ الایمان کو بنظر اجمال دیکھا ہے۔ باعتبار اصول اور اصل مقصود کے بہت خوب ہے اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کو ایسا دیکھا کہ پھر کسی کو ایسا نہ دیکھا یہ شخص ان میں سے ہے کہ جن کے حق میں حق سبحانہٗ تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ اور فرمایا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَةَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ پس جو ان کو کافر اور گمراہ کہے وہ آپ گمراہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔"[۲]

حکیم مومن خاں بھی عاملین بالحدیث سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت سید احمد شہید سے بیعت تھے۔ آزردہ اور مولوی فضلِ حق سے ان کی دوستی مشہور ہے کلب علی خان فائق لکھتے ہیں:

"مسلک کا اختلاف دہلی میں باعثِ ہنگامہ و فساد تھا۔ لیکن مومن اور شیفتہ یک جان و دو قالب تھے۔ مفتی صدرالدین خاں اور مولوی فضل حق خیرآبادی نے مومن کو شہرت دے کر حق دوستی ادا کیا۔"[۳]

ان لوگوں کا اختلاف محض علمی تھا۔ ایک دوسرے کے خلاف نہ سب و شتم تھا اور نہ معرکہ آرائی کبھی کبھار بحث و مناظرہ ان حضرات میں ضرور ہو جاتا تھا مگر تہذیب و شائستگی کے دائرہ میں۔ الحیاۃ بعد المماۃ کے مصنف لکھتے ہیں۔

---

[۱] اتحاف النبلاء صفحہ ۲۶ [۲] الدر المعقبۃ لتحفۃ الحنفیۃ مرتبہ مولانا ابوالحسنات محمد عبدالغفور داناپوری ص ۶ مطبوعہ یونین پریس ایلیج بانکی پور پٹنہ۔

[۳] مومن ص ۴۹۔

"میاں صاحب (سید نذیر حسین دہلوی جو مسلک اہلِ حدیث کے علمبردار تھے) اکثر فرماتے تھے کہ مباحثے اور مناظرے کے مناسب حدود چاہییں۔ امام جی کے حجرے میں شہزادہ فخرو کے سامنے ہر جمعہ کو مفتی صدر الدین خاں سے بحثیں دلچسپ غدر سے پہلے ہوا کرتی تھیں۔ اور وہ بحثیں نہایت لطف و مذاق کے ساتھ تھیں اب جس کو دیکھو تو تو میں میں کرتا آستینیں چڑھتی رہتی ہیں۔ تکا فضیحتی ایسی ہوتی ہے کہ معاذ اللہ معاذ اللہ ..." ؎۱

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"میاں صاحب اپنے زمانے کے شعراء میں کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے البتہ شاہ نصیر اور مفتی صدر الدین خاں کے اشعار اکثر برمحل پڑھتے اور کہتے کہ "دیکھو مفتی صاحب یوں فرماتے ہیں اور شاہ نصیر یوں فرماتے ہیں۔" ؎۲

؎۱ الحیات بعد الممات مصنفہ فضل حسین صفحہ ۴۷ مطبوعہ اکبری آگرہ ۱۹۰۸ء

؎۲ الحیات بعد الممات صفحہ ۲۰۳

باب ۶

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصّہ

غلامانہ زندگی سے نفرت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ انگریزوں کا تسلط ہندوستانیوں کی مرضی سے نہیں ہوا تھا بلکہ اس میں بڑی حد تک مغلوں کی نااہلی اور انگریزوں کی شاطرانہ چالوں کا دخل تھا۔ جوں جوں انگریزی اقتدار ہندوستان پر مستحکم ہوتا گیا۔ ہندوستانیوں کی توہین، دل آزاری اور ان پر ان کے مظالم کا سلسلہ بھی بڑھتا گیا۔ حساس اور باشعور طبقہ میں نفرت اور بغاوت کے جذبات ابھرنے لگے حتیٰ کہ جو لوگ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی طرف سے بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے وہ بھی محسوس کرنے لگے کہ مذہبی شعائر، تمدن و معاشرت اور سماجی زندگی بری طرح متاثر ہوتی جا رہی ہے۔ نہ تو اس ملک میں ہندوستانیوں کی عزت و آبرو محفوظ ہے اور نہ ان کی جان و مال، نہ ان کے حقوق کا کوئی لحاظ ہے اور نہ ان کی عزت نفس کا۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ وہ انگریزوں کے عزائم اور ان کے ناپاک منصوبوں کے خلاف تدبیریں سوچنے لگے۔ مفتی صدرالدین آزردہ اور ان کے رفیقان خاص مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا امام بخش صہبائی، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، نواب ضیاء الدین نیر رخشاں سب کے دل میں انگریزوں کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے۔

"۱۸۵۷ء سے تقریباً دس سال پہلے کی بات ہے۔ انقلابیوں کے قافلہ سالار دلاور جنگ احمد اللہ شاہ مدراسی جب اپنی انقلابی مہم لیکر دہلی تشریف لائے تو یہی فرزانہ روزگار مفتی صدرالدین آزردہ صاحب تھے جنھوں نے شاہ صاحب موصوف کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی جدوجہد کا مرکز دہلی کی بجائے آگرہ بنائیں پھر آپ ہی نے اپنے خط کے ذریعے شاہ صاحب

کا تعارف آگرہ کے ان زعماء اور علماء سے کرایا جو ایک طرف سرکاری حلقوں میں باوقار تھے تو دوسری طرف قومی اور ملی کارکنوں کا اعتماد بھی ان کو حاصل تھا۔ جنوبی ہند کا ایک غیر معروف نوجوان جو دہلی میں ناکام ہو چکا تھا۔ اس نے اس دور بے آئین میں جو سیاسی لحاظ سے بہت ہی نازک تھا۔ پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہتے ہوئے چند ہی مہینوں میں وہ غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی جس کی نظیر بہت ہی مشکل سے کہیں ملتی ہے۔ یہ بے شک حضرت شاہ صاحب کی غیر معمولی صلاحیت وقابلیت کی برکت ہے لیکن ایک منصف مزاج حقیقت پسند کو اس پر تامل نہ ہونا چاہیے کہ حضرت مفتی صاحب کے تعارفی خط نے بھی اساس اور بنیاد کا کام کیا ہے۔ دار الحکومت آگرہ کے اعلیٰ سیاسی طبقہ میں ایک غیر معروف شخص کے لیے رسوخ اور اعتماد حاصل کرنے کی کٹھن منزل جو سالہا سال میں طے ہوتی "حضرت مفتی صاحب کا مکتوب گرامی اور سیاسی طبقہ سے مفتی صاحب کا گہرا تعلق بھی تھا جس نے اس کو نہایت آسانی سے چند لمحوں میں طے کرا دیا۔" [۱]

یہ صحیح ہے کہ خاص اس ہنگامہ کے دوران مفتی صاحب کسی محاذ پر پیش پیش نظر نہیں آتے۔ جب دہلی میں مجاہدین کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ اجلاس برخاست کر کے چلے گئے۔ [۲] مسٹر لیاس مجسٹریٹ کو بھی اجلاس برخاست کرنا پڑا یہ صاحب بہادر اجلاس ختم کر کے مجاہدین کی بیخ کنی میں لگ گئے۔ لیکن مفتی صاحب انگریزی صدر الصدور ہوتے ہوئے بھی انگریزوں کے حامیوں کی صف میں شامل ہونے کے بجائے ۱۹ رمضان مطابق ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر کے دربار میں شامل ہوئے۔ چنانچہ عبد اللطیف خاں کا روزنامچہ اس بات کی تصدیق

---

[۱] علماء ہند کا شاندار ماضی جلد چہارم مصنفہ مولانا محمد میاں صاحب

[۲] کنز التاریخ صفحہ ۳

کرتا ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے۔

"صبح کے وقت جب بادشاہ کو اصلاح ملکی کا خیال پیدا ہوا۔ میاں نظام الدین۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر، نواب علی حسن خاں، نواب احمد علی خاں اعتماد الدولہ میر حامد علی خاں، نجم الدولہ مرزا اسداللہ خاں غالب نواب بڈھن صاحب خان جہاں خاں، ارادت خاں، مفتی صدر الدین خاں اور کرم علی خاں ایوان شاہی میں آداب بجالانے کے لیے حاضر ہوئے۔ اور زمین بوسی سے سرخروئی حاصل کی۔ اور ہر ایک نے ایک ایک خرہرہ پیش کیا" [1]

"۱۷ رجون کے دربار میں مفتی صدر الدین خاں بہادر شاہ ظفر کو دیوان حافظ دینے کے لیے آئے۔ بادشاہ نے ان سے فوجداری مقدمات فیصلہ کرنے کا شغل قبول کرنے کی بابت دریافت کیا۔ اگرچہ انھیں اس کی بہت آرزو تھی، لیکن ناساعد حالات کی بنا پر معذرت کردی" [2]

مگر یہ وقت کہ اب تک بہادر شاہ خود بھی مذبذب تھے اور اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوئے تھے جو انقلابی فوجوں نے آپ کے سر کردی تھی۔

جس طرح آپ کا در دولت عام حالات میں مرجع خلائق رہا کرتا تھا تحریک انقلاب کے وقت بھی انقلابی عناصر کا پناہ گاہ بنا رہا۔ انگریزوں کے سب سے زیادہ خطرناک دشمن جن کو "مجاہدین" کہا جاتا تھا۔ جن کی انگریز دشمنی کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری کی بنا پر نہیں تھی بلکہ حریت پسندی نے اس کو عقیدہ کی حیثیت دے رکھی تھی۔ ان سربکف مجاہدین کا ہجوم جس کے در دولت پر رہتا تھا وہ مفتی صدر الدین صدر الصدور ہی تھے۔

چنانچہ ۹ اگست ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے کہ کسی غلط فہمی کی بنا پر پچاس

---

[1] ۱۸۵۷ء کا روزنامچہ مرتبہ عبداللطیف خاں ص ۱۲۳

[2] " " " " ص ۱۳۵

سپاہیوں کا ایک دستہ حضرت مفتی صاحب کے مکان پر چڑھ دوڑا اس پر منشی جیون لال کا تحریری بیان ہے کہ

"یہ دیکھ کر کہ وہاں لشکر جہادی مقابلہ کے لیے تیار ہیں وہ واپس آگیا۔"[۱]

وہی باغی جس کی سرتابی اور سرکشی سے ہر ایک ابن الوقت لرز رہا تھا یہاں تک کہ خود بادشاہ کو ان کی شورہ پشتی کی شکایت تھی وہ شورہ پشت مفتی صاحب سے اس درجہ متاثر تھے کہ جو کام دوسرے نہیں کرا سکتے تھے بادشاہ کو یقین تھا کہ مفتی صاحب کرا سکتے ہیں۔ چنانچہ حکیم احسن اللہ خاں کا سامان لوٹ لیا گیا تو ۱۲ اگست کو بر سر دربار" بادشاہ نے مولوی صدر الدین خاں سے کہا کہ جب تک حکیم احسن اللہ خاں کا مال جسے سپاہیوں نے لوٹ لیا ہے واپس نہ کیا جائے گا اس وقت تک تمھیں دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی"[۲]

ظاہر ہے انقلابیوں کا گروہ اور انقلابی فوج مفتی صاحب سے اس درجہ متاثر اسی وجہ سے تھی کہ مفتی صاحب کی خاموش دلچسپی انقلابی سرگرمیوں سے وابستہ تھی۔

مفتی صاحب میں معاملات کو سلجھانے کی خداداد صلاحیت تھی۔ اس درمیان میں بعض مواقع بڑے نازک آئے لیکن مفتی صاحب کی دانشمندی نے ان اہم موقعوں پر معاملہ بگڑنے نہیں دیا۔ عین جنگ آزادی کے درمیان ایک خطرناک قضیہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جس کو نمٹانے کے لیے ۸ ذی الحجہ ۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر نے مفتی صدر الدین کو بھیجا۔ جس میں وہ نہایت خوش اسلوبی سے کامیاب ہوئے۔ چنانچہ عبد اللطیف اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں:

---

[۱] روزنامچہ منشی جیون لال صفحہ ۲۱۲

[۲] روزنامچہ منشی جیون لال ص ۲۱۲

"ایک گروہ نے قربانی کے متعلق یہ منادی کی ہے کہ گائے کی قربانی ہرگز نہ ہونے پائے۔ جب ان کی سرکشی حد سے گزر گئی تو تمام مسلمانوں نے ان کی تادیب کی کوشش کی۔ شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین مولانا شاہ احمد سعید جو قابلِ تعریف اور برگزیدہ ہستی ہیں سب سے پہلے ان مفسدوں سے جہاد کے لیے اٹھے اور جہاد کا جھنڈا جامع مسجد کے سامنے نصب کر دیا۔ اور جہاد کی تلقین کی اور عام دعوت دی۔ جوں ہی لوگوں نے سنا ان کے گرد جمع ہونے لگے جامع مسجد میں عقیدت مندوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ اکثر مجاہدین نے اسی جگہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اکثر دکانداروں نے انھیں خورد و نوش دینے کی ہمت کی۔ جب بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو مفتی صدر الدین کی زبانی جو سنجیدہ، شگفتہ مزاج، ذی علم با لحاظ آدمی تھے۔ مولانا شاہ احمد سعید کے پاس کہلا بھیجا اور یہ شعر بھی اپنے قلم سے لکھ دیا ؎

رخ مناب اے یار گر مشیت نیاز آرد کسے
نازنیں آں بہ کز وہر گز نیاز آرد کسے

پس مولانا نے بادشاہ کی ایما پر اپنا ارادہ جہاد ترک کر دیا۔" [1]

روزنامچہ منشی جیون لال میں بھی مفتی صاحب کے مذکورہ واقعہ اور مذکورہ تاریخوں میں بہادر شاہ ظفر کے درباروں میں شریک ہونے کی تصدیق کی ہے

"۲۔ اگست۔ آج بادشاہ دربار عام میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ جلوہ فرما تھے۔ مولانا امین الدین، سعادت علی خاں وکیل، فضل حسن خاں، ابراہیم علی خاں وکیل، اکبر علی خاں بھی دربار میں حاضر تھے۔ جنرل سمند خاں رسالدار غلام نبی خاں وکیل۔ حسن علی خاں اور مولوی صدر الدین خاں بھی شریک ہوئے ۱۲۶ روپے اور نو اشرفیاں بطور نذر پیش ہوئیں۔ بالعموم جنگی حالت

---

[1] روزنامچہ عبد اللطیف ص ۱۵۴ و ۱۵۵

پر بھی گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد بادشاہ نے چند اشعار سنائے جنھیں انھوں نے موزوں کیا تھا۔ یہ اشعار جنرل بخت خاں کے پاس بھیج دیے گئے تھے۔ ان کا مفہوم یہ تھا: "خدا کرے کہ دین کے دشمن تباہ و برباد ہو جائیں۔ خدا کرے فرنگی نیست و نابود ہو جائیں۔ قربانیاں کر کے عید قربان کے تہوار کو مناؤ اور دشمنوں کو تہہ تیغ کر دو۔ کوئی بچنے نہ پائے"۔

فتویٰ جہاد:۔ جنرل بخت خاں جب دہلی آئے تو انھوں نے جنگ میں شامل ہونے کے لیے دہلی کے عمائدین اور علماء کو جامع مسجد شاہ جہانی میں جمع کیا۔ اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا کہ انگریزی سامراج سے تصادم کے لیے مسلمانوں کو کس طرح آمادہ کیا جائے۔ کیا ہم میں ان سے قوت مقابلہ اس درجہ کی ہے کہ ہم ان پر فتح پا سکیں گے۔ چنانچہ جہاد کے لیے تاریخی فتویٰ مرتب کیا گیا۔ اور اس پر مشاہیر علماء سے دستخط کرائے گئے۔ اس تاریخی فتویٰ پر مفتی صدر الدین صاحب نے بھی دستخط کیے۔ چنانچہ استفتا کا مضمون یہ تھا۔

سوال: "کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی میں چڑھ آئے ہیں اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں؟ اور جو لوگ اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد چاہیے یا نہیں؟

بیان کرو اللہ تم کو جزائے خیر دے۔"

جواب: درصورتِ مرقومہ یہ فرض عین ہے اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے۔ اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے۔ بسبب کثرت اجتماع کے اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا۔ اور اطراف و حوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلے سے۔ یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض ہو جائے گا

اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے ہمارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہوگا۔ اور جو عدو بستیوں پر ہجوم اور قتل و غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض عین ہو جائے گا۔ بشرطیکہ ان کی طاقت کے۔ العبد المجیب احقر نور جمال عفی عنہ“

اس جواب کے نیچے حسب ذیل علماء کے دستخط اور مہریں ہیں۔

(۱) سید محمد نذیر حسین[1] (۲) رحمت اللہ (۳) مفتی صدر الدین (۴) مفتی اکرام الدین معروف بہ سید رحمت علی (۵) محمد ضیاء الدین (۶) عبد القادر (۷) فقیر احمد سعید احمدی (۸) محمد عنبر خاں (۹) محمد عبد الکریم (۱۰) فقیر سکندر علی (۱۱) محمد کریم اللہ (۱۲) مولوی عبد الغنی (۱۳) خادم العلما محمد عبد الغنی (۱۴) فرید الدین (۱۵) محمد سرفراز علی (۱۶) سید محبوب علی جعفری (۱۷) ابو احمد محمد حامی الدین (۱۸) سید احمد علی (۱۹) الٰہی بخش (۲۰) محمد مصطفےٰ ولد حیدر شاہ نقشبندی۔ (۲۱) محمد انصار علی (۲۲) مولوی سعید الدین (۲۳) حفیظ اللہ خاں (۲۴) محمد نور الحق عفی عنہ (۲۵) سراج العلماء ضیاء الفقہا، مفتی عدالت العالیہ محمد رحمت علی خاں (۲۶) واللہ الغنی و انتم الفقراء (۲۷) حیدر علی (۲۸) سیف الرحمٰن (۲۹) سید عبد الحمید عفی عنہ (۳۰) محمد ہاشم (۳۱) یا حافظ (۳۲) محمد امداد علی عفی عنہ

---

[1] ”الحیات بعد الممات“ جو مولانا سید محمد میاں نذیر حسین صاحب کی سوانح عمری ہے اس کے مصنف فضل حسین بہاری صاحب نے فتویٰ جہاد پر دستخط کرنے کے سلسلے میں پتہ نہیں یہ کیسے لکھ دیا کہ ”زمانہ غدر ۱۸۵۷ء میں جبکہ دہلی کے بعض مقتدر اور بیشتر معمولی مولویوں نے انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ دیا تو میاں صاحب نے نہ اس پر دستخط کیا اور نہ مہر۔ وہ خود فرماتے تھے کہ میاں وہ ہلڑ تھا بہادر شاہی نہ تھی وہ بے چارہ بوڑھا بادشاہ کیا کرتا حشرات الارض غارتگر اندازوں نے تمام دہلی کو خراب۔ ویران۔ تباہ اور برباد کر دیا بشرائط امارت و جہاد بالکل مفقود تھے ہم نے تو اس فتوے پر دستخط ہی نہیں کیا۔ مہر کیا کرتے اور کیا لکھتے مفتی صدر الدین خاں صاحب چکر میں آگئے“ ص ۶۷

۳۳. خادم شرع شریف رسول الثقلین قاضی القضاۃ محمد علی حسین۔

نیچے تحریر ہے۔ "حسب فرمان واجب الاذعان شاہی در جمیل المطابع دہلی سید جمیل الدین خاں ہنہم طبع نمود"

شکستِ دہلی کے بعد مفتی صاحب پر بھی انگریزوں کا عتاب

بے سرو پا روایتیں: نازل ہوا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح یہ بھی گرفتار ہوئے۔ یہ شعر غالباً اسی زمانے کا یادگار ہے ؎

آ پھنسے بیڈھب الٰہی دیکھیے کیسے بنے
مررہے ہیں سب الٰہی دیکھیے کیسے بنے

انقلابی تحریک سے اس درجہ وابستہ رہتے ہوئے سزائے موت یا حبسِ دوام لبعبور دریائے شور کی سزا سے مفتی صاحب محفوظ رہے تو اس پر لوگوں کو حیرت ہوئی اس بنا پر ایک عجیب و غریب افسانہ گڑھ لیا گیا کہ مفتی صاحب کی ذکاوت و ذہانت نے دستخط کے وقت بھی اپنے تحفظ کی صورت پیدا کر لی۔ پیروی مقدمہ میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں نے فتویٰ پر دستخط تو کیے لیکن اس کے نیچے "کتبت بالجبر" بھی لکھ دیا۔ عدالت نے اس کی تصدیق کی اور انھیں بری کر دیا۔

مفتی صاحب کی رہائی سے متعلق یہ واقعہ بعد میں کئی جگہ دہرایا گیا ہے "گل رعنا" خمخانہ جاوید" "غالب" "غدر کے علماء" "الثورۃ الہندیہ" "نصرت نامہ جنگ" میں تقریباً الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ یہی بات کہی گئی ہے کہ مفتی صاحب نے اس حیلہ سے رہائی پائی۔ مفتی نظام اللہ شہابی اس کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں دستخطوں کے نیچے "کتبت بالخیر" لکھ دینے کا عام رواج تھا۔ مفتی صاحب نے "بالجبر" پر نقطہ نہ لگائے علمائے وقت نے اسے "بالخیر" پڑھا۔ لیکن مفتی صاحب نے "بالجبر بنایا۔ اور جان چھڑائی۔

اولاً تو یہ عربی ذوق کے سراسر منافی ہے کہ کتبت کے ساتھ بالخیر یا بالجبر کا ٹکڑا لکھا جائے۔ دوسرے نفس فتویٰ سے بھی اس واقعہ کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہ فتویٰ

اخبار الظفر دہلی میں شائع ہوا تھا۔ وہاں سے اس کی نقل انھیں دنوں میں صادق الاخبار دہلی میں مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء میں چھپی تھی۔ یہ اخبار نیشنل آرکائوز میں محفوظ ہے۔ اور اس فتوی کا عکس "سوتنتر دہلی" ہندی اور نوائے آزادی میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ فتوی پر دستخط کرنے والوں میں مفتی صدر الدین کا نام تو ملتا ہے لیکن اس کے آگے پیچھے "کتبت بالجبر" وغیرہ کوئی عبارت ہی سرے سے نہیں ہے۔ یہ روایت بالکل اختراعی اور من گھڑت ہے۔ حقیقت اور واقعیت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔

مشہور محقق جناب امتیاز علی عرشی نے اپنے ایک مضمون میں اس فتوے کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا ہے [1]

اسی طرح خان بہادر ذکاء اللہ صاحب نے فتوی کی مہر کے بارے میں عجیب وغریب انکشاف فرمایا ہے لکھتے ہیں۔

"جنرل بخت نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتوی پر دستخط و مہریں کرالیں اور مفتی صدر الدین نے بھی ان کے جبر سے اپنی جعلی مہر کر دی"

اس بات کو سوائے اس کے کہ صریحی بہتان کہا جائے اور کچھ نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو شخص جنگ کے دوران بہادر شاہ ظفر کے دربار میں برابر آمد ورفت رکھتا ہو۔ نذرانے پیش کیے ہوں۔ جنگی مشوروں میں شرکت کی ہو۔ نازک گتھیوں کے سلجھانے میں پیش پیش رہا ہو۔ جس کے گھر پر مجاہدین کا جمگھٹا ہو۔ اس سے یہ توقع رکھنا کہ اس نے فتوی جہاد پر جبر یہ دستخط کر دیے اور مکر وفریب سے کام لیا کس طرح باور کیا جا سکتا ہے؟ مفتی صاحب ان لوگوں میں بھی نہیں ہیں جن کی ذات پر شک وشبہ کیا گیا ہو کہ وہ انگریزوں سے ساز باز رکھتے تھے۔ وہ تمام مجاہدین اور انقلابیوں کے معتمد علیہ رہے۔ ہاں اس سلسلہ میں ذکاء اللہ صاحب

---

[1] مولانا فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتوی جہاد ماہنامہ تحریک ماہ اگست ۱۹۵۷ء

نے ایک بات اور بھی لکھی ہے جو بڑی حد تک قرین قیاس ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ایک اور طریقہ بھی امیروں کے لوٹنے کا تھا۔ بعض ذی اختیار انگریز مجرموں کو سب طرح سے جرم سے بری ہونے کی اسناد دید یتے۔ اور ان سے خاطر خواہ روپیہ لے لیتے۔ مشہور ہے کہ نواب حامد علی خاں، مفتی صدر الدین خاں اور مکند لال مصر نے اس طرح زر کثیر دیکر اپنی جانیں بچائی تھیں"[1]

ممکن ہے کہ مفتی صاحب کے کسی عزیز، قریبی رشتہ دار یا دوست نے یہ معاملہ طے کر لیا ہو۔

فتویٰ جہاد پر دستخط کرنے کی پاداش میں مفتی صاحب پر کیا کچھ گزری؟

دورِ ابتلا: اس کا حال ان کے شاگرد نواب صدیق حسن خاں تحریر فرماتے ہیں۔

"در سنة ثلث و سبعین و مائتین و الف در ہنگامہ فساد افواج انگلیشیہ در ہندوستان چشم زخمی عظیم بایشاں رسید۔ ہم تعلق روزگار رفت و ہم جملہ جائیداد و معاش کہ دریں سی سال ملازمت بہم رسانیدہ بودند در سرکار ضبط گردید و ہم بہ تہمت افتاء جہاد باحکام مقید شدہ چندماہ در زنداں گزرانیدند۔ آخر الامر کہ عدم تصور ایشاں ثابت شد رہائی یافتہ"[2]

یعنی آپ کو ۱۲۷۳ھ میں انگریزی فوجوں کے ہنگامہ فساد میں سخت صدمہ اٹھانا پڑا۔ تعلق روزگار بھی ہاتھ سے گیا اور تمام جائیداد و املاک بھی جو آپ نے تیس سالہ ملازمت کے دوران پیدا کی تھی بحق سرکار ضبط ہو گئی۔ بلکہ جہاد کے فتویٰ کے الزام میں چندماہ تک جیل خانے میں بھی بند رہے۔ چونکہ ان کا قصور ثابت نہ ہوا اس لیے رہا کر دیئے گئے"

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۷۱۱

[2] اتحاف النبلاء ص۲۶۱

مفتی صاحب کے متعلق مرزا غالب نے حکیم سید احمد حسن مودودی کے ایک خط میں لکھا ہے۔

"مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹننٹ گورنر نے ازراہ ترحم نصف جائداد واگزاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرایہ پر معاش کا مدار ہے۔ اگرچہ یہ آمدنی ان کے گزارے کو کافی ہے۔ کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی۔ تیس چالیس روپے مہینہ کی آمدنی۔ لیکن چونکہ امام بخش چپراسی کی اولاد ان کی خترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ لہذا فراغ بالی سے نہیں گزرتی۔ ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے عشرۂ ثامنہ کی اواخر میں ہیں۔ خدا سلامت رکھے۔ غنیمت ہیں" [۱]

اس کے علاوہ ایک روحانی صدمہ مفتی صاحب کو جو اٹھانا پڑا، وہ ان کے عظیم الشان اور قیمتی کتب خانے کی بربادی تھی۔ ایک صاحب علم اور صاحب ذوق کے لیے کتابوں کے ذخیرہ سے جو دلچسپی ہوتی ہے اور اس کے لیے جو جستجو کرتا ہے وہ خود اہل علم پر مخفی نہیں۔ مفتی صاحب نہ صرف یہ کہ ایک بڑے عہدے پر تھے۔ آبائی جائداد بھی بہت بڑی تھی۔ متمول اور ذی حیثیت تھے۔ اسی لحاظ سے ان کی دولت کا بڑا حصہ کتابوں کی خرید پر صرف ہوا۔ پھر ان کا خاندان بھی علمی تھا۔ متعدد علما ان کے خاندان میں گزر چکے تھے۔ ان کی کتابوں کا ذخیرہ بھی تھا۔ مفتی صاحب کے براہ راست شاگرد مولوی فقیر محمد جہلمی ثم لاہوری کے بقول مفتی صاحب کا یہ ذخیرہ کتب جو ان کے دیوان خانے میں تھا تقریباً تین لاکھ کی مالیت کا تھا۔ اپنی کتاب "حدائق الحنفیہ" میں لکھتے ہیں۔

---

[۱] اردوئے معلیٰ ص۲۲

"غدر کے مقدمہ میں مفتی صاحب کو جو رہائی ملی تو وہ لاہور تشریف لائے۔ اور واسطے اپنے کتب خانے مالیتی تین لاکھ روپے کے جو دہلی کورٹ میں نیلام ہوا تھا حضور لارڈ لارنس کے پاس جو اس وقت پنجاب کے چیف کمشنر تھے اور مولانا ممدوح کے دلی میں بڑے مہربان رہ چکے تھے مطالبہ کیا۔ لیکن جائداد منقولہ کا واپس ہونا متعذر تھا۔ اس لیے مطلب میں کامیاب نہ ہو سکے۔" ؎

انگریزی غلبہ کے بعد دہلی پر کیا آفت آئی ایک بڑی دردانگیز داستان ہے۔ بے شمار افراد کو قتل کیا گیا۔ کتنوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ کتنوں کو جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ مصائب و آلام کی زد میں بیشتر افراد ایسے بھی تھے جو مفتی صاحب کے قریبی رشتہ دار، دوست، اور ساتھی تھے۔ آپ کے عزیز ترین دوست نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ بھی اسی زد میں آئے۔ گرفتار کیے گئے۔ سات سال کی قید تجویز ہوئی۔ مخلص دوست امام بخش صہبائی نہ صرف خود گولیوں کا نشانہ بنائے گئے بلکہ ان کے کنبے کے اکیس افراد کو قطار میں کھڑا کر کے ان پر باڑھ چلا دی گئی۔ اور سب کے سب ختم ہو گئے۔ مفتی صاحب کے لیے صہبائی کی شہادت کی خبر جاں گداز تھی۔ بے اختیار زبان سے نکلا ؎

کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دلی کی رونق ختم ہو کر رہ گئی۔ دولت مند، ارباب مناصب، اہل کمال کے لیے جینا دوبھر ہو گیا۔ اس وقت کی کیفیت کا اندازہ غالب کے خطوط سے بھی ہوتا ہے۔

میر مہدی مجروح کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"او میاں سید زادے۔ آزادہ۔ دلی کے عاشق دلدادہ۔ ڈھیے ہوئے اردو بازار کے

؎ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۲

کے رہنے والے ۔ حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے ۔ نہ دل میں مہر و آزرم ۔ نہ آنکھوں میں حیا و شرم ۔ نظام الدین ممنون کہاں ۔ ذوق کہاں ۔ مومن کہاں ۔ ایک آزردہ سو خاموش ۔ دوسرا غالبؔ وہ بیخود و مدہوش نہ سخنوری رہی نہ سخندانی کس برتے پر تتا پانی ۔ ہائے دلی وائے دلی ۔ بھاڑ میں جائے دلی ۔" [1]

اسی طرح دوسرے خط میں لکھتے ہیں ۔

" نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے ۔ دیکھیے کہاں اترتے ہیں ۔ اور کیونکر دربار کرتے ہیں آگے کے درباروں میں سات جاگیر دار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا جھجھر ۔ بہادر گڑھ ۔ بلب گڑھ ۔ فرخ نگر ، دوجانہ ۔ پاٹودی ۔ لوہارو چار معدوم محض ہیں ۔ جو باقی رہے انمیں سے دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی حصار کے ۔ پالوڈی حاضر ۔ اگر ہانسی حصار کے کلکٹر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رئیس ۔ ورنہ ایک رئیس ۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود ۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں ۔ میرٹھ میں مصطفےٰ خان ۔ سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں ۔ بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم ۔ شعر

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے [2]

---

[1] عودِ ہندی ص ۱۰۸

[2] " " ص ۴۴ و ۳۳ ، ۱۴

باب

جامع مسجد دہلی کی بازیابی

سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جامع مسجد شاہجہانی دہلی بھی زد میں آئی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہوئی کہ انگریزی فوج کے حملے کے وقت مسجد کے دروازے پر مسلمانوں نے سخت مقابلہ کیا تھا۔ اور انگریزی فوج کو پسپائی پر مجبور کر دیا تھا۔

سید ظہیر دہلوی اس کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں کہ

"ایک برن انگریزی فوج کا مسجد کی سیڑھیوں تک آپہنچا تھا اور کچھ لوگ فوج کے رعایا کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کرنے لگے۔ ادھر فوجیوں نے یہ چاہا کہ جامع مسجد میں داخل ہو جائیں۔ مسجد میں جو مسلمان مسافر جمع تھے انھوں نے دیکھا کہ اب یہ خدا کے گھر میں آکر کشت و خون کریں گے۔ تو بہتر یہ ہے کہ مسجد سے نیچے اتر کر ان سے سمجھ لیں۔ یہ کہکر وہ مسجد کے دروازے سے باہر نکل کر سیڑھیوں پر اترنے لگے۔ فوج والوں نے ان پر بندوقیں سر کیں۔ مگر جو زندہ رہے وہ سامنے چلے اور باہم جنگ مغلوبہ و دست بدست ہونے لگی۔ ایک غل، ایک شور، برپا ہو کر بلوا ہو گیا۔ لوگ گھروں میں سے لکڑیاں، پلنگ کی پٹیاں، تلواریں لے کر کے دوڑ پڑے اس برن میں کچھ لوگ مارے گئے باقی بھاگ کر لشکر میں چلے گئے۔"[1]

فتح کے بعد گورے یا تو قلعے میں چلے گئے یا انھوں نے زینت المساجد میں اپنا مرکز قائم کر لیا۔ سکھوں کا لشکر جامع مسجد میں قائم ہو گیا۔ مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں۔

---

[1] داستان غدر ص ۱۱۳ و ص ۱۱۴

جامع مسجد جو شہر کی کل مساجد کی ناک تھی اس کو یوں نکما بنایا کہ سکھ سپاہ کی بارک اس کو بنایا۔ اس میں بول و براز کرنے سے کچھ پرہیز انھوں نے نہیں کیا۔[1] شہر خالی پڑا تھا۔ بڑی بڑی حویلیوں اور عمارتوں کا شمار نہ تھا۔ سکھوں یا دوسرے دستوں کو کہیں بھی ٹھیرایا جا سکتا تھا لیکن انگریزوں کا جوش انتقام انھیں کسی طور پر دم نہ لینے دیتا تھا۔ اور وہ ایسی ایسی حرکتیں کرتے تھے جو مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ اشتعال انگیز اور نفرت خیز ہوں۔ پھر یہی نہیں بلکہ مسجد کو بند کر کے پہرے لگا دیے گئے۔ مرزا قربان علی بیگ سالک نے اپنی نظم "جہان آباد" کے مندرجہ ذیل بند میں کس درد سے لکھا ہے۔ ؎

ہجوم مسجد جامع کا کیا کروں اظہار
صف ملائکہ ہوتی جہاں نماز گزار
ہر ایک صف میں نہ رہتا مصلیوں کا شمار
اب اس کو دور ہی سے دیکھنا ہوا دشوار
نماز ہے نہ اذاں ہے نہ کوئی جاتا ہے
جب اس کو دیکھیے خالی تو جی بھر آتا ہے

پانچ سال تک تو انگریز بالکل چپ بیٹھے رہے اور مسجد بدستور اپنے قبضے میں رکھی۔ حالانکہ اس اثنا میں متعدد بڑے بڑے حاکم دہلی کا دورہ کر چکے تھے مفتی صدر الدین آزردہ نے عمائد شہر کی ہمنوائی میں مسجد کی واگذاشت کی سعی کی مفتی صاحب کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ ان کی کوششوں سے مسجد مسلمانوں کو پھر واپس مل گئی۔

مرزا غالب کے مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ جولائی ۱۸۶۲ء میں پرسش کا آغاز ہوا۔ اور مسجد کی واگذاشت کا مسئلہ چلا۔ نومبر ۱۸۶۲ء میں یہ مسجد واگذار

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ ص۷۱۹

ہوئی۔ اور دس آدمیوں کی ایک کمیٹی انتظام و نگرانی کے لیے بنا دی گئی۔

واضح رہے کہ مسجد بلا شرط و قید واگزار نہ ہوئی تھی بلکہ انتظامیہ کمیٹی کو استعمالِ مسجد کے لیے شرطیں منظور کرنی پڑی تھیں۔ استعمال کی شرطیں یہ تھیں جو اقرار نامے میں بطور ہدایات مرقوم تھیں۔

(۱) ادائے نماز کے بعد سب آدمی مسجد سے باہر چلے جایا کریں۔

(۲) موذن اور امام کے سوا رات کو کوئی شخص مسجد میں نہ رہے۔

(۳) ہندو بلا مزاحمت مسجد کے اندر آئیں مگر انھیں ادب ملحوظ رکھنا چاہیے

(۴) سول اور فوج کے افسر بھی اندر آنے کے مجاز ہوں گے۔ انھیں جوتا اتارنے کی احتیاج نہیں۔ امید ہے کہ وہ کتے ساتھ نہ لائیں گے اور سگریٹ وغیرہ نہ پئیں گے

(۵) فوجی گورے کمان افسر یا حاکم ضلع سے پاس لیے بغیر اندر نہ جا سکیں گے۔

(۶) دو سنتری شمالی اور جنوبی دروازوں پر متعین رہیں گے اور ان کی تنخواہ کی ذمہ دار کمیٹی ہوگی۔ اس کے علاوہ کمیٹی نے جو ذمہ داریاں اٹھائی تھیں وہ بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔

(۱) مسجد میں کوئی دنگا فساد نہ ہوگا۔

(۲) اگر کوئی مقدمہ مسجد کی بابت قائم ہوگا تو اس کا فیصلہ ہم خود کریں گے۔

(۳) مسجد میں کوئی بات ایسی نہ ہوگی جو سرکار کی تحقیر و اہانت یا بدخواہی کی موجب ہو۔ اگر کوئی ایسی بات ہوگی اور کمیٹی اس کا تدارک نہ کر سکے گی تو ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دے گی۔

(۴) کمیٹی مرمت کی ذمہ دار ہوگی۔ آمد و رفت کا حساب باقاعدہ رکھے گی۔

(۵) کمیٹی کا کوئی ممبر کم ہو جائے تو اس کی جگہ ممبر نیا آدمی تجویز کر لیں گے۔

(۶) اگر کوئی امر خلاف مرضی سرکار ظہور میں آئے تو سرکار مسجد کو بند کر دینے کی مجاز ہوگی۔

کمیٹی کے مندرجہ ذیل دس ممبر تھے۔

(۱) مرزا الٰہی بخش (۲) مفتی صدر الدین آزردہ (۳) محمد ابراہیم (۴) محمد ابراہیم ثانی (۵) محمد حسین (۶) نصیر الدین (۷) تراب علی (۸) حافظ داؤد (۹) محمد تفضل حسین (۱۰) محبوب بخش۔

حافظ سید محمد امام مسجد و مولوی تراب علی نے یہ اقرار نامہ لکھا اور ۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء کو اس پر دستخط ہوئے"۔ [۱]

---

[۱] ۱۸۵۷ء مصنفہ غلام رسول مہر ص ۱۹۲ و ص ۱۹۵

باب ۸

اپنی گذشتہ زندگی پر تبصرہ

مفتی صدر الدین خاں آزردہ کو ۱۸۵۷ء میں جو صدمہ برداشت کرنا پڑا اس نے ان کی زندگی کا سانچہ بدل دیا۔ کہاں امارت و ریاست، شان و شکوہ اور کہاں حسرت و اندوہ اور افسردگی و بیچارگی کا عالم! مصائب سے نجات ملی تو طبیعت پر طاعت و عبادت کا رجحان غالب ہوا۔ ریاضت و بندگی زندگی کا معمول بن گئی۔ ہمہ وقت دنیا سے بیزاری رہنے لگی اور دن اوراد و وظائف میں بسر ہونے لگے۔

شباب و جوانی میں جو کچھ کیا تھا اس کی تلافی کے لیے متوجہ ہوئے۔ اعمال حسنہ کے انجام دینے میں جو کوتاہی ہوئی تھی اس پر نہ صرف اظہار ندامت کرتے ہیں بلکہ اس کی تلافی کے لیے ہمہ تن کوشاں ہیں۔ پچھلی زندگی ان کی نگاہوں میں حقیر ہو کر

لہ یہ پورا خط رسالہ معارف اعظم گڑھ میں چھپا ہے اس پر تمہیدی نوٹ لکھتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے لکھا ہے "اس عہد میں خط و کتابت کی زبان فارسی تھی۔ مگر غالب کی جرأت آموزی نے دوسرے ادیبان ہند کو بھی اس کی ہمت دلا دی تھی کہ وہ بے تکلف اور رواں اردو میں اظہار مطلب کریں چنانچہ اس خط سے معلوم ہو گا کہ غالب کے علاوہ اور ان کے معاصر انشا پردازوں کی طرز تحریر بھی کیسی بے تکلف، سادہ اور رواں تھی۔ یہ خط مفتی صاحب کے شاگرد رشید نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی ایک ناتمام قلمی تاریخ قنوج میں دستیاب ہوا ہے (جلد ہفتم عدد پنجم و ششم ۱۹۲۱ء)

رہ گئی۔ اپنے عزیز ترین دوست نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کو اپنے دلی تاثرات ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں جو حقیقت میں ان کی پچھلی زندگی پر ان کا خود نوشت متبصرہ بھی ہے۔

"شکر ہے اوس پروردگار عالم کا جس نے مجھ کو ایسی دلدل سے کہ ہمہ تن اوس میں غرقاب تھا نکالا۔ کیسے علائق میں جکڑبند تھا کہ نکلا۔ اوس سے سوائے ایسی صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا۔ مقدمات اصلی کا فیصلہ کرنا منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا۔ رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا بمقدمات دورہ میں فتویٰ دینا۔ کمیٹیوں میں حاضر ہونا۔ طلباء مدرسہ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا۔ احکام اخیر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا۔ ہزارہا کاغذ کا دستخط کرنا۔ پھر گھر میں آکر طالب علموں کو پڑھانا۔ اور اطراف وجوانب کے سوالات شرعی کا لکھنا۔ دہا جیوں اور بدعتیوں کے جھگڑے میں حکم ہونا۔ مجالس شادی اور غمی اور اعراس میں جانا شعر وشاعری کی صحبت کو گرم رکھنا، باغات کی سیر کو اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا۔ الفتوں (بیگار لوگوں) کو ساتھ لے جانا۔ اور ان کی دعوت کا اہتمام کرنا یہ اشغال ایسے تھے کہ رات دن اسی میں غلطاں پیچاں تھا۔ اور جان کو ایک دم آرام نہ تھا۔ نہ کھانے کی حلاوت، نہ سونے کا مزہ۔ نہ طاعت کا لطف، نماز پنجگانہ بھی حسب عادت ادا ہوتی تھی۔ وجوہ فیصلہ لکھتے لکھتے ظہر کا وقت اکثر آجاتا تو وجوہ ڈگری وڈسمس کے عین نماز میں وسوسہ انداز ہوتی تھی۔ تنخواہ اور آمدنی رجسٹری کی جب آتی تو ریوڑیوں کی طرح بٹ جاتی۔ اگرچہ لوگوں کو میرے ہونے سے اس کام پر نفع تھا۔ مگر میری ذات کو کچھ فائدہ اور تمتع دنیا کا نہ تھا۔ اور آخرت کا حال یہ ہے کہ نوکری یعنی فصل خصومات موافق قوانین انگریزی کے اور یہ فتویٰ نویسی کو برعایت قواعد شرع ہو ہرگز جائز نہ تھی گو دباؤ سے ہمارے علم ووجاہت کے کوئی بول نہ سکتا تھا۔ اور اس گمراہ ہمیشہ اس سے رہا مگر کبھی چھوڑا نہیں۔ اس چالیس برس کی نوکری میں ہزارہا کو جتایا اور ہزارہا کو ہرایا سینکڑوں بسوہ داریاں

ہمارے حکم سے نیلام ہوئیں۔ صدہا آدمیوں کے قتل کا فتویٰ دیا۔ اور صدہا قید ہوئے سوائے اس کے اور گناہ بہتیرے ہیں جن کو میں جانتا ہوں اور جو علم الٰہی میں ہیں۔ اس کا کچھ حساب نہیں۔ ساری عمر صرف افعال بہیمی و حیوانی ہوئی اور اگر انسان ہوئے تو شیطان ہوئے۔ اسی کی مغفرت پر بھروسہ ہے ورنہ مواخذہ ہو تو کچھ ٹھکانا نہیں۔ حقوق اللہ وہ اپنے فضل عمیم سے بخشے گا۔ حقوق العباد بھی اس کے کرم سے بخشے جائیں گے۔

اَللّٰھُمَّ مَغْفِرَتُکَ اَوْسَعُ مِنْ ذُنُوْبِیْ وَرَحْمَتُکَ اَرْجیٰ عِنْدِی مِنْ عَمَلِیْ۔ جب یہ حال ہے تو کیا انعام احسان اس کا ہے کہ ایسے گرفتار علائق کو ان بلیات سے ایسا الگ کر دیا کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں۔ اور اگر اسی حال میں موت آجاتی تو نفس اسی آفات میں مبتلا رہتا جیسا کما تعیشون تموتون تحشرون اور کس وقت میں علیحدہ کیا کہ جب عمر ستر کو پہنچی اور پھر نجات کس مصیبت سے دی کہ کوئی مصیبت دنیا کی اس سے بڑھ کر نہ تھی۔ اور رزق کا ڈھنگ ایسا پیدا کر دیا کہ اس کی حلت میں کچھ شبہ نہیں۔ املاک متروکۂ پدری اس میں کم تھیں۔ اور اکثر زر خرید، اسی مال مشتبہ سے تھی وہ بالکل منتزع ہو گئی اور پھر سرکار سے مجدداً عطا ہوئی خواہ وہ آدھی ہو یا ساری۔ واسطے معاش کے کافی ہے۔

خَیْرُ الذِّکْرِ الْخَفِیُّ وَخَیْرُ الرِّزْقِ مَا یَکْفِیْ "اور نہ وہ کتابیں رہیں جن کا پڑھنا پڑھانا محض لغو و لاطائل تھا۔ کلام اللہ و منتخب احادیث بخاری و مسلم و حصن حصین و حزب الاعظم اور ادعیہ ماثورہ کہ ہر وقت اور ہر جگہ بہم پہنچتے ہیں۔ اور اگر بعد فراغ حوائج انسانی اور ادائے نماز پنجگانہ کے کل اوقات اس کے تلاوت اور ذکر الٰہی میں صرف ہوں اور یہی شعار (اوڑھنا) اور یہی دثار (بچھونا) ہو تو کیا خوش طالعی اور کیسی خوش نصیبی ہے۔ کہ دنیا اور آخرت دونوں حاصل ہیں۔ ایسی آسودگی اور فارغ البالی کہ ایک ذرہ بھی لگاؤ دنیا اور اہل دنیا سے نہ رہا۔ مجھ جیسے آلودہ علائق دنیا کو کہاں میسر تھی۔ اور پھر اس وقت میں کوئی دنیا کی

حسرت باقی نہیں رہی اور آفتاب عمر قریب غروب ہے اور ابھی ملک حواس قائم اور عقل درست اور تندرستی ہے۔ توبہ، انابت اور استغفار وطاعت وعبادت پروردگار کا اب تک باقی ہے۔ اگر بقیہ انفاس اسی میں گزر جاویں اور خاتمہ ایمان پر ہو تو نعمت دوجہانی حاصل ہے۔ امید احباب باصفا اور عزیزانِ بے ریا سے یہ ہے کہ یہی دعا میرے حق میں کریں بعض حمقاء اہل دنیا سے جب میرے واسطے یہ دعا کرتے ہیں کہ ابھی پھر وہی حکم حاصل ہو اور وہی اوج موج اور وہی ڈنکا بجے یا بعض سفہاء یہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہی حکمرانی ہو جاوے۔ پھر اختیار ہے چند روز بعد چھوڑ دینے کا۔ تو میں بہت ہنستا ہوں ان کی خفت پر۔ کوئی حسنِ عاقبت کی دعا نہیں کرتا۔

اَللّٰھُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِی الْاُمُوْرِ کُلِّھَا وَاَجِرْنَا مِنْ خِزْیِ الدُّنْیَا وَعَذَابِ الْاٰخِرَۃِ

خداوندا! ہمارے تمام کاموں کا انجام اچھا کر اور ہم کو دنیا کی ذلت اور عذاب آخرت سے نجات دے۔

اَللّٰھُمَّ اَقْسِمْ لَنَا مِنَ الْیَقِیْنِ مَا تُھَوِّنُ عَلَیْنَا مَصَائِبَ الدُّنْیَا

خداوندا! ہم کو ایسا یقین دے جس سے مصائب دنیوی آسان ہو جائیں

اَللّٰھُمَّ کَمَا رَزَقْتَنِیْ مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْہُ قُوَّۃً لِّیْ فِیْمَا تُحِبُّ۔

خداوندا۔ جس طرح تو نے مجھ کو محبوب چیزیں عطا فرمائی تھیں اسی طرح اس کو ان کاموں کے لیے ایک قوت بنا جو تجھ کو محبوب ہیں۔

آخری دو خواہشیں:۔ مفتی صاحب جبکہ خانہ نشین ہو گئے تو اس وقت ان کے دل میں رہ رہ کر یہی خواہش ہوتی رہی کہ کسی طرح ہندوستان چھوڑ کر عازم حجاز ہو جائیں اور حیات مستعار کے بقیہ دن اسی سرزمین مقدس میں بسر ہوں

جو مومن کا روحانی وطن اور عقیدت کا مرکز ہے۔ چنانچہ اپنے عزیز شاگرد نواب صدیق حسن خاں کے نام فارسی میں ایک مکتوب لکھتے ہوئے اپنی دو خواہشوں کا اظہار کیا ہے، ایک تو جوار رسول میں اقامت اختیار کر لیں۔ دوسرے دینی کتابوں میں بالخصوص احادیث و تفسیر کا مطالعہ کریں۔ نواب صاحب نے اپنی کتاب "اتحاف النبلا" میں اسے نقل کیا ہے لکھتے ہیں۔

"الحمد للّٰہ تا حال سر رشتہ آمد و شد انفاس درست دارم وا وقات عمر باقی ماندہ چنانکہ دل میخواست در گذرست۔ شعر

بے غم عشق تو صد حیف ز عمرے کہ گذشت
پیش ازیں کاش گرفتار غمت می بودم

اللہ تعالیٰ توفیق طاعت و امتثال احکام تشریعی از اوامر و نواہی و تسلیم احکام ارادی از صبر و رضا و موافقت و فنا ارزانی فرماید و تثبیت و استقامت براں عطا نماید و پائے ہمت ازیں جادۂ صواب و طریق مستقیم نہ لغزید۔ در اوقات خاصہ از دعائے حسن خاتمہ و نکوئی عاقبت مساہلہ نرود کہ حق ایں عاجز براں سلالۂ دودمان سیادت بسیار است۔ شعر

ہمت نگر کہ ہر ورق دفتر امید
صد پارہ کردہ ایم و بخوں ناب شستہ ایم

شکر و سپاس ایزدی ہماں ہر آن و ہر لمحہ مودی میکنم کہ تلہفی و تاسفی بر زوال زخارف دنیا کہ عبارت است از اسباب و سامان تعیش و ساز و برگ زینت حیات دنیوی بود اصلا بخاطرم خطور نمی کند۔ مگر بمقتضائے بشریت خواہش دو امر پیرامون دل پیر ماست۔ یکی آنکہ سر انجام زاد و راحلہ کہ برائے سفر حجاز اقامت آنجا در اوقات باقی حیات مستعار کہ ساعتی بیش نیست

کافی دلپسند باشد۔

دوم[۲] دست بہم دادن بعضے کتب دینیہ از تفسیر و حدیث و علمی
کہ نافع در دین ست نہ لغو یو علمی وز اثر الوزری۔ وھو المیسر لکل عسیر
وبالاجابۃ جدیر۔" [۱]

آخری ایام :۔ عمر کے آخری مرحلے میں جب قوی کمزور ہو گئے تو طاعت و عبادت
کے ساتھ ان کا محبوب مشغلہ طلبہ کو پڑھانا تھا۔ اگرچہ مالی لحاظ سے وہ حیثیت نہ
رہ گئی تھی کہ طلبہ کے اخراجات کا بار برداشت کریں۔ لیکن جہاں تک بن پڑتا تھا
طلبہ کی دیکھ بھال بھی کر لیتے تھے۔ اس سلسلے میں نواب صاحب رام پور جناب
کلب علی خاں کو توجہ دلاتے ہوئے خط میں لکھتے ہیں۔

"اب عمر اس خاکسار کی قریب بہ ہشتاد سال پہنچی ہے۔ ابتدائے جوانی تا ایام
پیری کبھی خالی مشغلہ درس و تدریس سے نہیں رہا۔ اور اس عرصے میں صدہا طلباء
علوم ہر دیار و رئیس زادگان والا تبار کو استفادہ حاصل ہوا۔ اب تک بھی باوجود
پیری و بیماری کے طالب علم جو مکان پر سکونت پذیر ہیں و بعض اطراف و جوانب
سے آتے ہیں بطور تحقیقات استفادہ حاصل کرتے ہیں اور مجھ کو بھی ایک دم بدون
اس شغل کے کہ قدیم سے خوگر اس کا ہوں چین نہیں آتا۔ اور اخراجات ضروری و لابدی
طلباء مذکورین میرے ذمہ ہے۔ علاوہ اس کے عزیز و اقارب بھی میرے ہیں کہ ان
کی مایحتاج ضروری کا بھی کفیل ہوں۔ اگرچہ اب تک مجھ کو خاص اپنی ذات کے واسطے
کسی امر کی حاجت چنداں نہیں تھی الا بسبب خانہ نشینی و زیر باری و بیکاری سالہا
سالی کہ محض بہ اتفاق لیل و نہار پیش آئی ہے۔ فی الحال اس اخراجات کا انصرام مجھ
سے محض دشوار ہے۔ اور تکلیف طلباء و عزیزان دیکھی نہیں جاتی خواہی نخواہی باعث

---

[۱] اتحاف النبلاء ص ۲۶۱

گذارش حال ہے

من کجا و ذوق گل چیدن کجا اے باغبان
نالۂ بلبل بزور ایں جا مرا آوردہ است

اگر خدام والا مقام از راہ سرداری و قدرشناسی ارباب کمال کچھ وظیفے مقررہ برائے چندے کہ جس سے گزارۂ اوقات طلباء علوم و عزیزان ہووے. یقین فرماویں تو باعث نیک نامی کا دنیا میں موجب اجر عظیم کا آخرت میں ہوگا. ع

با کریماں کارہا دشوار نیست

و نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ خاکسار آفتاب لب بام ہے. غایت سے غایت اجراء اس وظیفہ کا چھ مہینے سے زیادہ نہ کھینچے گا. یقین ہے کہ آپ جیسے سردار باہمت سے واسطے مجھ جیسے ترقی خواہ قدیم کے اور پھر ایسے امر خیر میں کہ وہ بھی برائے چند روزہ ہے توجہ دریغ نہ ہوگی."

اس درخواست کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو سَو روپے ماہوار مقرر کر دیے گئے[1]

مفتی صاحب کے کوئی صلبی اولاد نہ رہی. ان کی معنوی اور روحانی اولاد طالبانِ علم و فن تھے اور ان سے ان کی دلبستگی عمر کے آخری دنوں تک باقی رہی۔

اس کے علاوہ طبیعت میں فیاضی اور جود و سخا کا مادہ فطری طور پر بہت زیادہ تھا۔ اس لیے اپنی آمدنی میں اوروں کو بھی شریک بنا لیا تھا۔ مفتی صاحب کے جو خطوط خواجہ احمد فاروقی صاحب نے شائع کیے ہیں ان میں طلبہ کے علاوہ اپنی بیماری کا ذکر ہے۔ دواؤں کی فرمائش ہے. تہنیت و مزاج پرسی ہے۔ اور اپنی بیوی کے حقیقی بھانجے عنایت الرحمٰن خاں سابق ڈپٹی کمشنر محکمہ دریافت انعامات

---

[1] کلاسیکی ادب. مجموعۂ مضامین خواجہ احمد فاروقی میں دو خط نواب یوسف علی خاں کے نام اور چار خط نواب کلب علی خاں کے نام ہیں. یہ تمام خطوط فاروقی صاحب کو ریاست رام پور کے محکمہ عالیہ دار الانشاء صیغۂ دست نو آشنایان سے دستیاب ہوئے ہیں۔

سرکار نظام دکن کے لیے اعانت و وظیفہ کی اپیل بھی ہے۔

عنایت الرحمن صاحب۔ مفتی صاحب کے متبنّیٰ تھے جنھیں وہ نہایت عزیز رکھتے تھے۔ مفتی صاحب نے انتقال سے ایک دن پہلے جو خط نواب کلب علی خاں کو لکھا ہے ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ اس کو میں نے فرزندانہ پرورش کیا ہے اور نہایت لائق و سعادت مند اور نیک چلن ہے اپنی زوجہ ضعیفہ اور ان کو آپ کے سپرد کیے جاتا ہوں میرے بعد ان کی خبر گیری فرماتے رہیں۔"[۱]

مفتی صاحب دو سال تک فالج کے مرض میں مبتلا رہے۔ بقول مرزا غالب "پرسوں (۱۱ دسمبر) کو فالج ہو گیا ہے۔ سیدھا ہاتھ رہ گیا۔ زبان موٹی ہو گئی ہے بات مشکل سے کرتے ہیں اور کم سمجھ میں آتی ہے۔" (اردوئے معلی ص ۲۳۴)

چنانچہ یہی فالج کا مرض ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔

وفات:- اکیاسی سال کی عمر میں جمعرات کے دن ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو مفتی صدر الدین آزردہ نے انتقال کیا۔ دہلی کے ہفتہ وار اکمل الاخبار نے آپ کی وفات پر مندرجہ ذیل سطریں لکھیں۔

"اگرچہ اہل کمال کے مرنے کا ہر حال میں صدمہ جاں گزا ہوتا ہے۔ مگر اس صورت میں جاں گزا سے بھی سوا ہے کہ ان دنوں میں جناب فضیلت مآب، زبدۃ العلماء عمدۃ الفضلاء، دانش آموز مشائیاں۔ دانش اندوز اشراقیاں، مولانا مفتی محمد صدر الدین خاں بہادر متخلص بہ آزردہ صدر الصدور سابق دہلی نے وفات پائی۔ تمام اہل شہر کو اس قدر رنج و الم ہوا ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اور یہ واقعہ ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء یوم پنجشنبہ چار بجے دن کے جاں گزائے مردم شہر ہوا مغرب

---

[۱] مفتی صاحب کی زوجہ کا نام لاڈو بیگم تھا۔ رام پور میں نواب صاحب کے نام لاڈو بیگم کی عرضی بھی فارسی میں ہے جس میں انھوں نے آزردہ کے کتب خانہ کی فہرست بھی فارسی میں بھیجی ہے اس عرضی کے بعد دو سو روپے لاڈو بیگم کے مقرر کر دیے گئے (کلاسکی ادب ص ۸۳)

کے وقت جنازہ جامع مسجد میں آیا۔ نماز پڑھائی گئی۔ خلقت کا بہت ہجوم تھا۔ بعد انفراغ نماز درگاہ چراغ دہلی میں حسب وصیت حضرت مغفور دفن کیا۔ یکشنبہ کو فاتحہ ہوئی۔ تمام عمائدین و روسائے شہر جمع ہوئے۔ مگر جس کو دیکھا افسردگی و غم سے خالی نہ تھا۔ تاریخ وفات جو مرزا قربان علی بیگ سالک نے لکھی ہے وہ یہ ہے۔ قطعہ ؎

صدر آرائے دین و مفتی شہر	کہ جسے لاکھ نے یگانہ کہا
سب نے اس کی وفات کو سن کر	رنج و اندوہ کا فسانہ کہا
سال اس واقعہ کا سالک نے	مرگیا فاضل زمانہ کہا
	۱۲۸۵

(جلد ۳ عدد ۳۰۔ مورخہ ۲۲ جولائی ۱۸۶۸ء)

میر مہدی مجروح نے حسب ذیل قطعۂ تاریخ وفات لکھا۔

صدر الدین خاں آسماں رتبہ	جن کا سینہ بنا تھا مصدر علم
فاضل و مفتی و فقیہ زماں	تھی وہ ذات شریعت در خورِ علم
تھا تبحر تباس سے باہر	ان کا کیا ہو کوئی تنا گر علم
ان سے تھی آب و تاب جوہر فضل	ان سے تھی آبروئے گوہر علم
یوں وہ دنیا سے جائیں صد افسوس	کیوں نہ رہنہ نہ غم سے ہو بیر علم
مظہر علم ذات تھی ان کی	کیوں نہ تاریخ بھی ہو مظہر علم

(جلد ۳۔ عدد ۱۳۱۔ ۱۵ اگست ۱۸۶۸ء)

اکمل الاخبار دہلی عرصے تک مفتی صاحب کی تاریخ وفات شائع کرتا رہا چنانچہ ۱۹ اگست ۱۸۶۸ء کے شمارے میں پنڈت نشن نرائن مجبور کی حسب ذیل تاریخ وفات درج کی ہے ؎

مفتی ذی جاہ صدر الدین خاں دلی باکمال

چوں ازیں دار فنا شد عازم باغ جناں

سال تاریخ وفات آں مہ اوج شرف

در خورِ خود ہر یکے آورد در نظمِ بیاں
از پئے تاریخِ آں مہجور دل مجروح ہم
از سرِ افسوس گفتہ ۔ مرد صدر الدین خاں

۱۲۸۵ھ

لیکن مفتی صدر الدین خاں کے شاگرد شمس الشعراء مولوی ظہور علی نے جو قطعۂ تاریخ وفات لکھا اس نے بڑی شہرت پائی۔ اور تمام تذکرہ نگاروں نے اسی کو نقل کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

چہ مولانائے صدر الدین کہ در عصر | امام اعظم آخر زماں بود
زہے صدر الصدور نیک محضر | بعدل وداد چو نوشیرواں بود
بروزِ پنجشنبہ کرد رحلت | کہ ایں عالم نہ جائے جاوداں بود
ربیع الاول و بست و چہارم | وداع او سوئے دار الجناں بود
ظہورا فسوس آں استاد ذی قدر | پدر دارم ہمیشہ مہرباں بود
چراغش ہست تاریخ ولادت | کنوں گفتم چراغِ دو جہاں بود

نواب صاحب رام پور کی مالی اعانت :۔ صدر الصدوری کے منصب سے معزولی اور ضبطیٔ جائداد کے بعد مفتی صاحب کی مالی حالت کمزور ہو گئی تو ریاست رام پور ان کے لیے بڑا سہارا ثابت ہوئی۔ نواب کلب علی خاں والئ رام پور کے والد نواب یوسف علی خاں کو مفتی صاحب کی شاگردی کے تعلق کی بنا پر یک گونہ خصوصیت بھی تھی۔ چنانچہ ریاست کی جانب سے آخری زندگی تک مفتی صاحب کو وظیفہ ملتا رہا۔ جب مفتی صاحب نے انتقال فرمایا تو نواب کلب علی خاں نے ان کی تجہیز و تکفین کے حیلے سے مفتی صاحب کے پسماندگان کو مبلغ پانچ سو روپے عطا فرمائے۔ اس مالی اعانت کی خبر دہلی کے مشہور ہفتہ وار اخبار

اکمل الاخبار میں بھی شائع ہوئی۔[1]

اس زمانے میں مرزا غالب بھی پریشان تھے۔ اس لیے نواب کلب علی خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں "حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت۔ سلامت، بعد تسلیم معروض ہے آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدر الدین کی زوجہ کو پانچ سو روپے مفتی جی کی تجہیز و تکفین کے واسطے رام پور سے بھیجے ہیں۔ فقیر کو بھی توقع پڑی کہ میرا مردہ بے گور و کفن نہ رہے گا۔ جیسا کہ مرزا جلال اسیر کہتا ہے۔

جرعۂ لطف تو بعد از بما خواہد رسید

میں نے کل ایک خط نواب مرزا خاں (داغ) کو لکھا ہے۔ خدا جانے وہ حضرت کی نظر سے گزرے یا گزرے۔ اس خط میں میں نے زوجہ مفتی جی کا حال یہ لکھا ہے کہ وہ لاولد ہے۔ اور ساٹھ روپے کرایہ کے مکان اس کے تحت ہیں۔ امین الرحمٰن اس کا بھانجہ ہے مفتی جی کا کوئی نہیں۔

اب میں اپنی حقیقت عرض کرتا ہوں۔ آخر عمر میں تین التماسیں ہیں آپ سے ایک تو یہ کہ میں ہزار بارہ سو کا قرض رکھتا ہوں، چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے۔ دوسری یہ کہ حسین علی خاں کی شادی آپ کی بخشش خاص سے ہو جائے اور یہ سو روپیہ مہینہ جو مجھے ملتا ہے اس کے نام پر اس کے حین حیات قرار پائے یہ دونوں خواہشیں خواہ میری زندگی میں خواہ میرے بعد اجرا پائیں۔

تم سلامت رہو قیامت تک
دولت و عز و جاہ روز افزوں

روز شنبہ ۵ ربیع الثانی، ۲۷ جولائی۔ سال حال عرضداشت دولت خواہ اسد اللہ۔ (لفافہ پر ۲۷ جولائی ۱۸۶۸ء درج ہے۔[2])

---

[1] اکمل الاخبار جلد ۳۔ ص ۳۹۔ ۳۰ ستمبر ۱۸۶۸ء[2] دار الانشاء سرکار دولت مدار رام پور مثل ۲۳۳ صیغۂ دوست آشنایاں۔

غالب کی ضرورت اپنی جگہ پر۔ لیکن یہ ان کے لیے کسی طرح مناسب نہ تھا کہ اپنے مخلص دوست کی بیوہ کی امداد میں رکاوٹ ڈالیں۔ زندگی بھر مفتی صاحب سے دوستانہ تعلقات رہے۔ اور ہمیشہ انھیں "دوست غمگسار۔ یار وفا شعار" کہتے رہے۔ ان کو "میر و مخدوم و مطاع والی جولائے من" کے القاب سے پکارتے رہے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے اعزہ و اقربا کبھی ہمدردی و دلجوئی کے مستحق تھے۔ نہ کہ محض اپنا کام نکالنے کے لیے ان کی ضرورت کو غیر اہم قرار دیا جائے۔ اس قسم کا رویہ غالب جیسی شخصیت کو زیب نہیں دیتا۔ خواجہ احمد فاروقی بالکل صحیح لکھتے ہیں۔

"ان کا (غالب) جو معاملہ بعض معاصرین اور خاص طور پر آزردہ کے ساتھ رہا ہے وہ صریحاً اتنا قابل اعتراض ہے کہ اس کے لیے کوئی وجہ جواز ڈھونڈنا مشکل ہے۔ غالب کی عظمت صرف ان کی تخلیقات میں نظر آتی ہے۔ جہاں وہ اپنے طبقہ اور سماج کی خرابیوں سے بلند ہو کر اپنی سحر کار آواز سے سب کو متوجہ کر لیتے ہیں۔" [1]

---

[1] کلاسیکی ادب از خواجہ احمد فاروقی ص ۸۶

باب ۹

ممتاز تلامذہ

مفتی صدر الدین آزردہ کی زندگی کا بڑا حصہ درس و تدریس میں گزرا۔ صدر الصدوری اور افتاء کے فرائض سے جب فرصت پاتے تو طلبہ کے پڑھانے میں لگ جاتے۔ اپنی اسی دلچسپی کی بنا پر انھوں نے شاہجہانی مدرسہ دارالبقا کو دوبارہ قایم کیا۔ اور اس کے اندر طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام کیا۔ معقولات، منقولات اور ادب کی منتہیانہ کتابوں کے پڑھانے میں ان کو جو ید طولیٰ حاصل تھا اس کی شہرت دور دور تک تھی۔ طریقۂ تدریس میں وہ خاندان ولی اللہی اور سلسلۂ خیرآباد دونوں کے جامع تھے۔ ان کے سرچشمۂ علم سے برصغیر ہند و پاک کے بے شمار تشنگان علم سیراب ہوئے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد بھی جبکہ ان کی حالت سقیم ہو گئی، ان کا فیضان علمی جاری رہا۔ ان کے شاگردوں کے زمرے میں والیانِ ریاست بھی ہیں اور حکام عالی مقام بھی بڑے بڑے جید علماء بھی ہیں اور صلحائے احترام بھی۔ ادبائے عصر بھی ہیں اور شعرائے نادر الکلام بھی۔ ان کے تلامذہ کی تعداد سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ہوگی جن کی فہرست ملنا دشوار ہے۔ پھر بھی تذکروں اور تاریخوں میں کہیں کہیں ان کا ذکر ملتا ہے اور ان کی نسبت شاگردی کو نمایاں جگہ دی گئی ہے ذیل میں ان کے چند ممتاز تلامذہ کے مختصر احوال دیے جاتے ہیں۔

۱- مفتی سعد اللہ مراد آبادی:- ان کی پیدائش ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء میں ہوئی تاریخ پیدائش "ظہور حق" اور "بیدار بخت" سے نکلتی ہے۔ بچپن ہی میں فارسی کتابوں سے فراغت حاصل کر لی۔ شوق طالب علمی سر میں سمایا تو رام پور پہنچے۔ اول صرف

نحو پڑھی۔ اس کے بعد نجیب آباد میں مولوی عبدالرحمٰن قہستانی سے شرح جامی پڑھی۔ اور کافی استعداد حاصل کر کے دہلی پہنچے۔ اخوند شیر محمد ولایتی، مولوی محمد حیات پنجابی اور مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور سے اکثر درسی کتابیں پڑھیں۔ ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء میں وارد لکھنؤ ہوئے۔ وہاں مولوی محمد اسمٰعیل مراد آبادی۔ مرزا حسن علی محدث۔ اور مفتی ظہور اللہ لکھنوی سے تحصیل علم کی۔ تحصیل علم اور شادی کے بعد مدرسہ شاہی (لکھنؤ) میں مدرس ہوگئے۔ پھر تاج اللغات (فارسی ترجمہ) کی بعض جلدوں کی تالیف اور اس کے بعد کچہری کوتوالی لکھنؤ کے مفتی کے عہدہ پر ۲۵ سال رہے۔ اسی زمانے میں سفر حج کی توفیق بھی نصیب ہوئی۔ شیخ جمال مکی سے علم حدیث کی جدید سند حاصل کی۔ اور لکھنؤ واپس آ گئے اور عہدۂ افتا پر مقرر ہوگئے۔ واجد علی شاہ کے معزول ہونے کے بعد نواب یوسف علی خاں کے بلانے پر رام پور پہنچے۔ نواب رام پور ان کے شاگرد ہوئے۔ عہدۂ قضا۔ افتا اور مرافعہ (اپیل) پر سرفراز ہوئے نواب کلب علی خاں کے زمانہ تک اسی عہدہ پر فائز رہے ۲۴ رمضان المبارک بروز اتوار ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں بمقام رام پور داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور وہیں دفن ہوئے ان کی تصنیفات سے مندرجہ ذیل یادگار ہیں۔

(۱) مفید الطلاب فی خاصیات الابواب (۲) القول الفضل فی ہمزۃ الوصل (۳) عقود الاجیاد فی مجہول اختار وانقاد۔ (۴) نوادر الاصول فی شرح الفصول (۵) غایۃ البیان فی تحقیق السبحان۔ (۶) رسالہ ترکیب بسم اللہ (۷) خلاصۃ النوادر (۸) نوادر البیان فی علم القرآن (۹) رسالہ منہ فی وجود الفنۃ (۱۰) القول المانوس فی صفات القاموس (۱۱) نور الصباح فی اغلاط الصراح۔ (۱۲) ترجمہ قاموس بعض مجلدات (۱۳) ترجمہ فقہ اکبر (۱۴) وصیت نامہ امام ابو حنیفہ (۱۵) ترجمہ حقیقۃ الاسلام (۱۶) ہدایۃ النور فیما یتعلق بالاظفار والشعور (۱۷) زاد السبیل الی دار الخلیل (۱۸) حواشی مالا بدمنہ (۱۹) رسالہ طہر متخلل (۲۰) حاشیہ بر شرح سلم مولوی حمد اللہ سندیلوی (۲۱) شرح ضابطۃ التہذیب (۲۲) شرح خطبہ قطبی

(۲۳) رسالہ قوس قزح (۲۴) رسالہ تناسخ (۲۵) رسالہ تحقیق علم واجب (۲۶) رسالہ سبع عرض شیرہ موسومہ بغبید البصیرۃ (۲۷) حاشیہ بر شرح چغمنی (۲۸) رسالہ تشبیہ و استعارہ (۲۹) رسالہ عروض با قافیہ (۳۰) میزان الاذکار شرح معیار الاشعار (۳۱) شرح قصیدہ لامیہ ۔ (فارسی)

(تذکرہ علماء ہند ص ۲۱۴)

۲- **شیخ محمد ہادی**:- مولانا ابوالکلام آزاد کے دادا ہیں۔ انھوں نے علوم کی تکمیل مفتی صدر الدین سے کی اور شاہ عبدالعزیز کے مشورے سے مولانا منور الدین (مولانا آزاد کے نانا) نے اپنی بڑی لڑکی ان سے منسوب کردی یہ اپنی غیر معمولی ذہانت اور حافظے کی وجہ سے ضرب المثل تھے۔ کہا جاتا ہے پوری قاموس، تمام کتب درسیہ اور ان کے حواشی اس طرح از بر تھے کہ ان کے اساتذہ کہا کرتے تھے کہ اگر یہ کتابیں گم ہو جائیں تو یہ اپنے حافظے سے پھر لکھ سکتے ہیں۔ لیکن انھوں نے بہت کم عمر پائی اور تقریباً ۲۵ سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔ اس وقت مولانا آزاد کے والد مولانا خیرالدین تین یا چار برس کے تھے۔ اور ان کی پرورش مولانا منور الدین نے کی۔

آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی بروایت ملیح آبادی ص ۹۴-۹۵

۳- **مولوی ظہور علی دہلوی**:- مولوی محمد ظہور علی دہلوی مرحوم خلف مولوی فتح علی خاں بہادر ۱۲۲۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ کتب درسیہ مفتی صدرالدین خاں آزردہ سے پڑھیں۔ اوائل مشق سخن میں چند غزلیں شاہ نصیر اور حکیم مومن خاں کو دکھائیں۔ بعد ازاں ذوق مرحوم سے تلمذ اختیار کیا۔ ملازمت پیشہ اور مشہور خوشنویس تھے۔ پہلے مدت تک کتابت دار رہے۔ پھر سررشتہ تعلیم میں مدرس فارسی مقرر ہوئے۔ سرکار شاہی سے "شمس الشعراء" کا خطاب ملا تھا ۱۲۸۹ھ

میں بعمر ۶۵ سال انتقال کیا۔ ان کے والد سرکار انگریزی کے جاگیر دار تھے۔ گورنر جنرل ہند نے بمقام دہلی ۱۸۲۲ء میں بصلہ مدح گستری انھیں خلعت فاخرہ عنایت کیا تھا۔ سرکار شاہی سے بھی اکثر انعام و اکرام ملتے رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بیٹے منشی ذوالفقار حسین مدرسہ دہلی میں مدرس تھے۔ اور انھوں نے غنی تخلص اختیار کیا تھا۔

ظہور مرحوم کو معمّا میں بڑا کمال تھا۔ اس فن میں ایک رسالہ جسمیں معمّا حل کرنے کے قاعدے لکھے ہیں نظم میں مرتب کیا تھا۔ اس کتاب کو مرزا قادر بخش گورگانی نے طبع کرایا تھا مگر یہ نسخہ ایام غدر میں تلف ہو گیا۔ دیوان مطبوعہ میں بیشتر حصہ غدر کے بعد کی تصنیف ہے۔ قصیدے اور مرثیے بھی خوب کہتے تھے۔ تاریخ گوئی میں بھی اچھا ملکہ تھا۔ ظرافت اور بذلہ سنجی میں مشہور زمانہ تھے۔ فکر بلند اور مضامین دل پسند ہیں۔

(خمخانۂ جاوید جلد پنجم ص ۴۷۹)

۴۔ مولانا نور الحسن کاندھلوی :۔ حضرت شاہ عبد العزیز کے شاگرد رشید حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے پوتے مولانا نور الحسن کاندھلوی ہیں۔

۲۶ ربیع الثانی ۱۲۲۷ھ کو پیدا ہوئے۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ اپنے والد مولانا ابو الحسن اور اپنے دادا مفتی الٰہی بخش کی آغوش تربیت میں نشو و نما پائی۔ تکمیل علم کے لیے ۱۲۴۷ھ میں دہلی کا سفر اختیار کیا۔ دہلی میں حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث، مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدر الدین صاحب سے علوم معقول و منقول حاصل کیا۔ اپنی ذہانت و فطانت کی بدولت اساتذہ کی نظروں میں بہت ہر دلعزیز رہے۔ قوت حافظہ غضب کی تھی۔ جو بات ایک دفعہ سن لی یا دیکھ لی وہ ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہو جاتی پھر ذوق طلب کا یہ حال تھا کہ مفتی صدر الدین صاحب نے ابتداء میں وقت نہ ہونے کا عذر کیا۔ مولانا

کے بہت اصرار پر کہا کہ کچہری آتے اور جاتے وقت مل سکتا ہے۔ مولانا نور الحسن صاحب نے اس کو منظور کر لیا۔ چنانچہ مفتی صاحب پالکی میں گھر سے کچہری جاتے تو مولانا نور الحسن پالکی کے ساتھ دوڑتے جاتے تھے۔ اور سبق پڑھتے جاتے تھے کچہری پہنچتے ہی سبق موقوف ہو جاتا تھا۔ اور انتظار میں بیٹھ جاتے تھے مفتی صاحب جب کچہری کے کام سے فارغ ہو کر پالکی میں واپس ہوتے تو پھر واپسی میں جس قدر سبق ہو چکا تھا اس کو پورا کرتے تھے۔ مہینوں یہی معمول رہا۔ پھر مفتی صاحب نے مستقل وقت دینا شروع کیا۔ مفتی صدر الدین صاحب نے میرزاہد پر حاشیہ لکھا تھا۔ تو مولانا نور الحسن صاحب نے اس حاشیہ کو اسی زمانے میں نقل کیا۔ علوم فلسفہ و حکمت میں کمال امام فن مولانا فضل حق خیر آبادی سے حاصل کیا۔

ان دونوں استادوں کو مولانا نور الحسن صاحب سے جو شدید تعلق تھا اس کا بخوبی اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو ان صاحبان نے مولانا موصوف کو لکھے ہیں۔ جن کو مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد سلیمان صاحب نے ایک جگہ کتابی صورت میں جمع کر دیا ہے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد مولانا کو دیوبند ضلع سہارنپور میں تحصیلداری کا عہدہ تفویض کیا گیا۔ سرکاری ملازمت میں بعض امور ناگوار خاطر ہوتے اس لیے استعفا دے دیا۔ پھر ریاست الور کی طلب پر الور تشریف لے گئے۔ راجکمار کے استاد اور مربی بنے۔ راجہ صاحب نے آپ کی قدردانی اور عزت افزائی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ لیکن ہولی دیوالی، دسہرہ ہندوانی تہواروں کے موقعہ پر درباری آداب سے دل برداشتہ ہو گئے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مولانا فضل حق اور مفتی صدر الدین صاحب سے استصواب بھی فرمایا۔ ان دونوں صاحبوں نے بضرورت اس کی اجازت دی لیکن غیرت ایمانی اور جذبۂ دینی نے اس کو برداشت نہ کیا۔ ریاست سے قطع تعلق کر کے آگرہ کالج میں عربی کی پروفیسری اختیار کی۔ آگرہ کے دوران قیام میں سر سید احمد خاں

نے مولانا سے کچھ کتابیں پڑھیں۔ نماز کے معاملے پر سکریٹری کالج سے اختلاف ہوا اور آپ نے کالج کو بھی خیرباد کہدیا۔ اور پھر اپنے وطن مالوف کاندھلہ میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ مولانا سے جن لوگوں نے استفادہ کیا یا تعلیم پائی ان میں مولانا عبدالحق خیرآبادی، مولانا احمد حسن مرادآبادی، مولانا محمد سورتی خاص طور سے لائق ذکر ہیں۔

۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں مولانا نورالحسن نے نمایاں حصہ لیا۔ مولانا احمداللہ شاہ نے تحریک جہاد کو کامیاب بنانے کے لیے آگرہ میں جو مجلس علماء تشکیل دی تھی اس کے ایک اہم رکن مولانا نورالحسن بھی تھے۔ ۱۱ محرم الحرام ۱۲۸۵ھ کو وفات پائی۔ آپ کے صاحبزادوں میں مولانا محمد ضیاالحسن عرف محمد صادق مولانا حکیم محمد ظہورالحسن عرف محمد ابراہیم۔ مولانا محمد فیض الحسن عرف محمد اکبر۔ مولانا محمد ریاض الحسن عرف محمد سلیمان فضل وکمال کے چہار گلزار تھے۔ حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلوی اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اسی خانوادہ علم وفضل سے تعلق رکھتے ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیے۔ حالات مشائخ کاندھلہ ۱۴۴ تا ۱۶۶ مصنفہ احتشام الحسن کاندھلوی)

۵-نواب محمد یوسف خاں ناظم والیٔ رام پور:- آپ نواب محمد سعید خاں بہادر کے صاحبزادے ہیں۔ ۵ مارچ ۱۸۱۶ء ۵ ربیع الثانی ۱۲۳۱ھ کو پیر کے دن پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں ان کے والد مرحوم انگریزی علاقے میں مقیم تھے نواب یوسف صاحب ناظم زمانۂ طالب علمی میں دہلی آگئے۔ اور مرزا غالب سے فارسی پڑھی۔ ان ہی ایام میں مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے عربی اور دیگر علوم عقلیہ، منطق وغیرہ پڑھے۔ غالب کے علاوہ خلیفہ غیاث الدین رام پوری سے بھی فارسی پڑھی تھی۔

ناظم اپنے والد کے جانشین ہوئے ابھی اس واقعہ پر مشکل سے دو برس

گزرے تھے کہ مئی ۱۸۵۷ء میں مشہور ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ریاست رام پور بھی نرغے میں گھر گئی۔ لیکن انھوں نے نہایت حزم واحتیاط سے کام لیا۔ اور کسی شورش میں شریک نہیں ہوئے بلکہ انگریزوں کی بہت قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ ان ہی کارگزاریوں کے صلے میں لارڈ کیننگ۔ گورنر جنرل نے ۱۵ نومبر ۱۸۵۹ء کو فتح گڑھ کے دربار میں بیس ہزار روپے کا خلعت عطا کیا۔ اور سلامی گیارہ کی جگہ تیرہ ضرب مقرر ہوئی۔ نیز "فرزند دلپذیر" کا خطاب ملا۔

سرکار انگریزی نے ۱۸۶۰ء میں ۱۰۴ گاؤں کا ایک علاقہ جدید ضلع بریلی میں بطور جاگیر عطا کیا۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں (جولائی ۱۸۶۱ء) اسٹار آف انڈیا کا ایک خاص آرڈر قائم ہوا تھا۔ لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور وائسرائے نے یکم نومبر ۱۸۶۱ء کو نائٹ کا خطاب اور تمغہ دیا۔ جب سر جان لارنس ان کی جگہ مقرر ہوئے تو ۱۸۶۴ء میں اپنی مجلس وضع قوانین کا رکن مقرر کیا۔ اس سلسلہ میں یہ کلکتہ تشریف لے گئے لیکن وہاں کی آب وہوا راس نہ آئی بیمار پڑ گئے مجبوراً گورنر جنرل کی رضامندی سے رام پور چلے آئے لیکن مرض نے بڑھ کر سرطان کی شکل اختیار کر لی۔ درمیان میں تھوڑے دنوں کے لیے صحت ہوئی۔ لیکن ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ کو جمعہ کے دن دوپہر کے وقت خالق حقیقی سے جاملے۔ آپ بھی اپنے والد کی طرح امامیہ مذہب کے پیرو تھے۔ وفات کے بعد ان کے جانشین ان کے صاحبزادے نواب کلب علی خاں بہادر ہوئے۔

(تفصیل کے لیے۔ اخبار الصنادید ص ۱۰۹ انتخاب یادگار ص ۴۳ تلامذہ غالب مالک رام ص ۲۷۴ تا ص ۲۷۶)

مولانا فیض الحسن فیض سہارنپور کے ایک

۶۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری: زمیندار گھرانے میں ۱۸۱۶ء (۱۲۳۲ھ) میں پیدا ہوئے۔ والد حافظ خلیفہ علی بخش ایک عالم فاضل بزرگ تھے۔ فیض الحسن نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد سے حاصل کی۔ اور مروجہ عربی وفارسی کتب پڑھیں

کھیل کود کے علاوہ پہلوانی اور بنوٹ وغیرہ فنون سے بھی دلچسپی رہی ۔ ۱۹، ۲۰ سال کی عمر میں شادی ہو گئی ۔ لیکن تحصیل علم کے شوق میں دلی پہنچے ۔ دلی میں مفتی صدرالدین آزردہ سے اکتساب فیض کیا ۔ شاہ احمد سعید مجددی اور آخون صاحب ولایتی (اخون شیر محمد) سے جو اس دور کے جلیل القدر فاضل تھے ۔ حدیث کا درس لیا ۔ مولانا فضل حق خیرآبادی سے معقولات و ادبیات کے سبق پڑھے ۔ مولانا امام بخش صہبائی ، حکیم مومن خاں مومن ۔ اسد اللہ خاں غالب اور خاقانی ہند ابراہیم ذوق کی شعری و ادبی محفلوں میں شریک رہے ۔ شاعری میں امام بخش صہبائی کے شاگرد ہوئے ۔ کچھ عرصہ تک رام پور اور لکھنو کے تعلیمی مرکزوں میں بھی رہے ۔ دلی کے ایک نامور طبیب حکیم امام الدین خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں ۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دلی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں دلی سے نکلے اور کچھ عرصہ تک سہارنپور میں طب پر گزر اوقات کرتے رہے ۔ پھر علی گڑھ چلے گئے ۔ جہاں عربی کی چند کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ۔ اور سنہ ۱۸۷۰ء کے اوائل میں اورینٹل کالج کے قیام پر ڈاکٹر لائٹنر نے ان کی خدمات کالج کے لیے حاصل کر لیں ۔

سنہ ۱۸۷۰ء میں مولانا فیض الحسن صدر شعبۂ عربی و سپرنٹنڈنٹ تحقیق و تصنیف کی حیثیت سے اورینٹل کالج لاہور میں آ گئے ۔ ان کی علمی و تدریسی شہرت دور دراز گوشوں تک پہنچنے لگی ۔ اور تشنگان علم اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے لاہور کا رخ کرنے لگے ۔ لاہور میں مولانا فیض الحسن کا قیام بازار حکیماں میں رہا ۔ موسم گرما کی تعطیلات میں وہ اکثر سہارنپور چلے جاتے تھے ۔ اور وہاں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھتے تھے ۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی مدرسۃ العلوم دیوبند اور مولانا فیض الحسن کے مراسم بڑے بے تکلفانہ تھے ۔ دونوں ہم عمر بھی تھے ۔ اور ایک ہی بزرگ حاجی شیخ امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکی کے مرید بھی تھے ۔

اورینٹیل کالج میں آکر مولانا فیض الحسن نے درس وتدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ۱۸۷۱ء میں انھوں نے سنین الاسلام (اسلام کی سیاسی وعلمی تاریخ دو جلدوں میں) کی تالیف میں ڈاکٹر لائٹنر کا ہاتھ بٹایا۔ شرح سبعہ معلقہ (عربی، فارسی)، اردو، شرح حماسہ رشیدیہ۔ نیقیبہ (علم مناظرہ۔ اردو) کی تالیف کے علاوہ انھوں نے دیوان حسان مرتب کیا۔ ان تالیفات کے علاوہ مولانا فیض الحسن اورینٹل کالج کے ماہوار علمی وتحقیقی مجلہ "شفاء الصدور" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔

مولانا فیض الحسن سہارنپوری اورینٹل کالج کی عربی کی جماعتوں کے علاوہ گورنمنٹ کالج کی آرٹس کی جماعتوں کو بھی درس دیتے تھے۔ اورینٹل کالج میں ۱۷ برس تک تدریسی وتصنیفی خدمات سرانجام دینے کے بعد ۶ فروری ۱۸۸۷ء کو مولانا فیض الحسن وفات پاگئے۔ ان کی نعش تابوت میں رکھ کر ریل میں سہارنپور لے جائی گئی اور وہیں تدفین ہوئی۔ مولانا فیض الحسن کی وفات کے بعد ان کے فرزند اکبر مولوی رشید احمد اورینٹل کالج میں بحیثیت مدرس عربی وفارسی ملازم ہوئے۔ اور ۱۹۲۲ء تک یہ خدمت سرانجام دینے کے بعد سبکدوش ہوئے۔

مولانا فیض الحسن سہارنپوری نے عربی علوم وادبیات کی جس شمع کو اورینٹل کالج میں فروزاں کیا۔ اس سے دور دور کے طالبان ذوق نے اکتساب فیض کیا۔ مولانا شبلی کا شمار بھی انھیں میں ہوتا ہے۔ بقول علامہ سید سلیمان ندوی "مولانا فیض الحسن اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاک ہند نے صدیوں میں شاید کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو" (حیات شبلی)

مذکورہ تالیفات کے علاوہ لتعلیقات علی الجلالین۔ تحفہ صدیقیہ۔ عروض المفتاح۔ ریاض الفیض۔ دیوان الفیض۔ حل ابیات بیضاوی ہیں۔

(تاریخ اورینٹل کالج مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۶۲ء)

تفسیر نظام القرآن کے مصنف علامہ حمید الدین فراہی نے بھی مولانا

فیض الحسن سے عربی ادب کی تکمیل کی۔ شاگرد کو استاد کے ساتھ جو تعلق تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ استاد کا عربی دیوان شاگرد نے اپنے صرف سے محض خدمت علم کے لیے شائع کرایا۔ اور ان کی وفات پر ایک دردانگیز مرثیہ لکھا۔

۷۔ مولوی کریم الدین پانی پتی :۔ مولوی کریم الدین بن شیخ سراج الدین پانی پت میں ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ وہ اردو کے نامور مدرس مصنف اور صحافی تھے۔ انھوں نے اردو زبان میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ اور شائع کیں مشہور و معروف مختصر سا اردو لغت "کریم اللغات" آپ ہی کی ہے۔ انھوں نے عربی۔ اردو شعراء کے تذکرے اور انتخابات بھی لکھے ہیں۔ ان کے تذکرۂ شعراء اردو، گلدستہ نازنیناں، طبقات الشعراء ہند کی بڑی شہرت ہے۔ آخر الذکر تذکرہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں شریک مصنف کی حیثیت سے " ایف۔ فیلن " کا نام بھی شامل ہے۔ عربی شعراء کا بھی ایک تذکرہ " فرائد الدہر " کے نام سے لکھا ہے۔ جو اب بالکل نایاب ہے۔ اس میں تین سو ستانوے (۳۹۷) عربی شعراء کے حالات درج ہیں جن میں (۱۷) بر صغیر پاک و ہند کے شاعر ہیں، یہ تذکرہ بھی مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا ہے۔ اس تذکرے کا علم پروفیسر محمد ایوب قادری کے ایک مضمون مطبوعہ رسالہ "الرحیم" حیدرآباد پاکستان سے ہوا۔ اس تذکرہ میں مولوی کریم الدین نے اپنے اساتذہ مولانا مملوک العلی اور مفتی صدر الدین آزردہ کے حالات و مناقب عقیدت کی زبان میں لکھے ہیں۔ مفتی صاحب کے متعلق لکھتے ہیں۔

"شیخنا و استاذنا وہادینا و مرشدنا حاکمنا مفتی محمد صدر الدین خاں بہادر ابقاء اللہ الیٰ یوم الدین گنجینۂ علم و کان حلم و بحر سخا مخزن لطف و جود و عطا لبید دوراں، حسان ہندوستان

عالم کامل ، فاضل اجل ، فقیہ بے مثل ، حاکم دہر مصداق ایں ؎

شیخ جہاں پناہ کہ از روے مکرمت — بر سرورانِ عالم تحقیق سرور است
دارائے ملک لطف و کرم ، ہادی امم — کاوصاف ذات پاکش از اندیشہ برتر است

بندہ نے بھی کتاب صدرا علم فلسفہ میں ان سے پڑھا تھا۔ لیکن ان کے تبحر کے سامنے سب بھول جاتا تھا جو کچھ میں دیکھ کر جاتا تھا وہ سب بیان کر دیتے تھے۔ اور رد و قدح ان پر کر کے سب حاشیوں کو مخدوش کر ڈالتے تھے اس وقت اپنے آپ تقریر صاف مثل موتیوں کے تشفی فرماتے تھے۔ میرزاہد امور عامہ بھی میں نے ان سے پڑھا ہے۔ یہی حال ہر کتاب میں پایا۔ ایسی ایسی کتابیں جو انتہائی فضیلت کی ہیں ان کے سامنے ایسی ہیں جیسے آمد نامہ یا خالق باری ایک بڑے فاضل کے سامنے ہوں ،، (تذکرہ فرائد الدھر صفحہ ۳۹۶)

مولوی کریم الدین نے ۱۸۶۹ء میں وفات پائی ۔

شاہ عالم کے عہد

۸ ۔ نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر رخشاں دہلوی :۔ میں مرزا عارف جان بخارا سے ہندوستان آئے ۔ مرزا عارف جان کے چار بیٹے تھے ۔ نبی بخش خاں احمد بخش خاں ، الٰہی بخش خاں اور محمد علی خاں ان میں سے احمد بخش خاں اور الٰہی بخش خاں نے شہرت دوام کے خلعت حاصل کیے ۔ یہی وہ الٰہی بخش خاں ہیں جو اردو زبان میں معروف کے تخلص سے مشہور ہیں ۔ مرزا غالب کے خسر اور مولانا فخر الدین چشتی کے مرید و خلیفہ بھی تھے ۔ معروف نے اگر علم و فضل اور تصوف و سلوک کے میدان میں شہرت حاصل کی تو ان کے بڑے بھائی احمد بخش خاں نے ریاست و جہانبانی کی دنیا میں اپنا سکہ جاری کیا ۔

نواب احمد بخش خاں کو انگریزی سرکار کی طرف سے فیروز پور جھرکہ ، سانکرسی ، پونا ہانہ ، بچھور ، اور نگینہ کا علاقہ استمراری جاگیر میں عطا ہوا اور

مہاراجہ بختاور سنگھ والئی الور نے لوہارو کا پرگنہ اضافہ کر دیا۔

نواب احمد بخش نے اپنے پیچھے چار بیٹے چھوڑے۔ ایک بیوی سے نواب شمس الدین خاں (متوفی ۱۸۳۵) اور ابراہیم علی خاں۔ اور دوسری سے نواب امین الدین خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں تھے۔

شمس الدین احمد خاں اپنے والد کی حین حیات ۱۸۲۶ء میں فیروز پور جھرکہ کے حکمراں ہو گئے تھے۔ لوہارو کی جاگیر نواب احمد بخش خاں نے اپنے دوسرے بیٹوں کے نام لکھ دی ہماری زبان کے مشہور شاعر نواب مرزا داغ ان ہی شمس الدین احمد خاں کے بیٹے تھے۔

نواب احمد بخش خاں اکتوبر ۱۸۲۷ء (ربیع الاول ۱۲۴۳ھ) میں فوت ہوئے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں اپنے والد کی وفات کے وقت چھ برس کے تھے۔ یہ فیروز پور جھرکہ میں اکتوبر ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ تقسیم جائداد کی رو سے پرگنہ لوہارو ان کے ساتھ ان کے بڑے بھائی نواب امین الدین احمد خاں دونوں کے حصے میں آیا تھا۔ جب تک سن بلوغ کو ضیاء الدین خاں نہیں پہنچے جائداد کا نظم و نسق بڑے بھائی کے ہاتھ میں رہا اور ان کے حصے کی آمدنی خزانے میں جمع ہوتی رہی۔ بالغ ہونے پر نواب ضیاء الدین خاں نے مطالبہ کیا کہ مجھے بھی ریاست میں برابر کا شریک کیا جائے۔ ورنہ ریاست دو حصوں میں تقسیم کر دی جائے۔ حکومت انگریزی نے یہ دونوں تجویزیں نامنظور کیں۔ اور چوں کہ بھائیوں میں کشمکش روز بروز بڑھتی جارہی تھی اس لیے ۱۸۳۵ء میں فیصلہ کیا کہ آئندہ نواب ضیاء الدین خاں کو خزانۂ ریاست سے اٹھارہ ہزار روپیہ نقد سالانہ وظیفہ ملتا رہے۔ اور وہ ریاست کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ اس پر یہ لوہارو سے نقل مکان کر کے مستقلاً دہلی مقیم ہو گئے۔ ان کی وفات کے یہ وظیفہ گھٹا کر بارہ ہزار سالانہ کر دیا گیا تھا جو ملک کی آزادی تک ان کے خاندان میں جاری رہا۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی، علم تفسیر و حدیث حضرت شاہ عبد القادر کے شاگرد رشید مولوی کریم اللہ سے۔ ادب و فقہ جناب مفتی صدر الدین آزردہ سے اور فلسفہ و منطق مولانا فضل حق خیرآبادی سے حاصل کیے۔ فارسی میں غالب کے شاگرد تھے اور مشق سے خود اس زبان کے استاد بے بدل ہو گئے۔ عربی اور ترکی بھی اچھی جانتے تھے ان کی فارسی میں استادانہ حیثیت کا اعتراف ان کے معاصرین کو بھی تھا۔ نجوم اور ہیئت میں بھی بہت اعلیٰ واقفیت رکھتے تھے۔ تاریخ اور جغرافیہ میں ان کی دستگاہ کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ بالخصوص ایشیاء کے مختلف ممالک کی تاریخ پر ایسا عبور تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ تمام عمر مطالعہ کتب میں گزری۔ ان کے کتب خانے میں ہر طرح کی کتابیں موجود تھیں۔ افسوس کہ یہ سارا سرمایہ ۱۸۵۷ء میں وقت تاراج ہو گیا۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ بیس ہزار سے کم مالیت کا نہ ہوگا۔ غدر کے بعد پھر جمع کرنے لگے۔ جب حکومت ہند کے سکریٹری ایلیٹ صاحب نے اپنی مشہور تاریخ لکھی جس میں ہندوستان کے فارسی اور عربی مورخوں کی کتابوں کے ترجمے شائع کیے تو نواب ضیاء الدین خاں نے انھیں فراہمی کتب اور ترجمے میں بہت مدد دی تھی۔ نواب صاحب کا بچا کھچا یہ کتب خانہ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے نواب سعید الدین احمد خاں نے ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کو دیدیا۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص تھا۔ اپنے استاد کے مایہ ناز شاگرد ثابت ہوئے اور میرزا غالب کو ان پر فخر تھا۔ انھوں نے ایک زوردار فارسی قصیدہ بھی نیر رخشاں کی مدح میں کہا ہے۔ غالب نے اپنی زندگی میں سند خلافت لکھ دی تھی۔ خلیفہ اول نیر رخشاں۔ اور خلیفہ دوم نواب علاء الدین احمد خاں علائی۔ رخشاں کا تمام کلام نظم و نثر بھی غدر میں ضائع ہو گیا تھا۔ بعد میں جو کچھ جمع ہو سکا اسے ان کے صاحبزادے نواب سعید الدین احمد خاں طالب

نے "جلوۂ صحیفۂ زریں نیر رخشاں" کے نام سے ۱۹۱۵ء میں شائع کرایا تھا۔

۱۳؍رمضان ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۷؍جون ۱۸۸۵ء بروز دوشنبہ دوپہر کے وقت رحلت فرمائی۔ مہرولی میں حضرت خواجہ بختیار کاکی قدس سرہٗ کی درگاہ میں اپنے والد ماجد اور برادر بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔

(تلامذۂ غالب۔ مالک رام ص ۲۸۵ تا ص ۲۹۳)

۹- مولانا محمد مظہر نانوتوی: ۱۸۲۲ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و حفظ قرآن اپنے والد حافظ لطف علی سے کیا۔ "دہلی کالج" میں تعلیم حاصل کی۔ مولانا مملوک علی نانوتوی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ حدیث کی سند حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ سے حاصل کی۔ مفتی صدر الدین اور مولانا رشید الدین سے بھی استفادہ علمی فرمایا۔ مولانا محمد مظہر تحصیل علم کے بعد اجمیر کالج میں ملازم ہو گئے۔ وہاں سے آگرہ کالج تبادلہ ہوا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا۔ مولانا محمد مظہر کے پیر میں گولی لگی۔ جہاد شاملی کے بعد تمام ستر کار مصائب و آلام میں مبتلا رہے۔ مولانا محمد مظہر بھی روپوش ہو گئے۔ اسی زمانے میں کچھ دنوں بریلی بھی رہے۔ جب عام معافی ہوئی تو ظاہر ہوئے۔ ملازمت سرکاری سے قطع تعلق ہو گیا۔ گھر پر طلباء کو درس دینا شروع کیا۔ جب ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں مولوی سعادت علی سہارنپوری نے ایک مدرسہ سہارنپور میں جاری کیا۔ مولوی سخاوت علی انبیٹھوی، مولوی عنایت علی اور حافظ قمر الدین مدرس مقرر ہوئے تین مہینے بعد شوال ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء میں مولانا مظہر اس مدرسے کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس مقرر ہوئے۔ جب مدرسے کو ترقی ہوئی تو حافظ فضل حق نے اپنے مکان کو مدرسہ کے لیے وقف کر دیا۔ مکان کی عمارت توڑ کر مدرسہ کی تعمیر کی گئی مدرسہ تعمیر ہونے کے بعد مدرسہ کا نام مظاہر العلوم تجویز ہوا۔

مولانا محمد مظہر حدیث و فقہ میں بڑا درک رکھتے تھے۔ مولانا محمد احسن نانوتوی نے حسب مولوی خرم علی بلہوری کے ورثاء سے درمختار کا اردو ترجمہ

اشاعت کی غرض سے خریدا تو اس کتاب کے بقیہ ترجمے اور صحت و درستی میں مولانا محمد منظہر نانوتوی پورے پورے شریک رہے۔ مولانا منظہر نانوتوی نہایت متقی، پرہیزگار، منکسر المزاج اور نیک نفس بزرگ تھے۔ ۱۳۰۲ھ/۱۸۵۸ء میں سہارنپور میں لاولد فوت ہوئے۔ آپ کے تلامذہ میں بڑے بڑے ممتاز علماء، مثل مولانا خلیل احمد انبیٹھوی وغیرہ تھے (مولانا محمد احسن نانوتوی از محمد ایوب قادری ص ۱۵۴ تا ص ۱۵۶)

مولوی امیر حسن سہسوانی: مولوی امیر حسن بن لیاقت علی فاضلی تقریباً ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء میں سہسوان میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ میں مولوی عبد الجلیل سے فرخ آباد میں مولوی بشیر الدین قنوجی سے اور لکھنؤ میں علمائے فرنگی محل اور مولوی تراب علی سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد دہلی میں مفتی صدر الدین آزردہ، میاں نذیر حسین شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی، الشیخ عبد الحق بنارسی جیسے اکابر کی خدمت میں رہ کر اکتساب فیض کیا۔ عامل بالحدیث تھے۔ نصاریٰ کا بھی خوب رد کیا ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں انتقال ہوا۔

(تفصیل حیوٰۃ العلماء ص ۶۴ تا ص ۶۶)

۱۱۔ مولانا حکیم سید نذیر احمد شاہ سہسوانی: مولانا حکیم نذیر احمد شاہ خلف اصغر حضرت خواجہ سید آل احمد شاہ ۱۲۴۳ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد بزرگوار کی وفات کے وقت ۱۵ سال کی عمر تھی۔ پہلے علوم درسیہ اپنے برادران معظم سے حاصل کیے۔ اور شیخ احمد حسن مرادآبادی و دیگر فضلاء سے تعلیم پائی۔ پھر دہلی تشریف لے گئے۔ اور مدت دراز تک قیام کیا۔ کتب ادب و بلاغت مولوی محمد فیض الحسن سہارنپوری، فلسفہ و منطق مولوی فضل حق خیرآبادی و مفتی صدر الدین خاں دہلوی سے استفادہ کر کے علوم دینیہ تفسیر و حدیث تکمیل کو پہنچائی۔ بعدہ فن طب مشہور طبیب حکیم سید فیض علی تلمیذ، سید حکیم قدرت اللہ و حکیم عزت اللہ شاگردان

حکیم محمد شریف مرحوم سے حاصل کرکے وطن کو واپس ہوئے۔ اور خلق اللہ کی فیض رسانی علاج و معالجہ کے کام میں مشغول ہوئے۔ اور اس فن میں خاص شہرت حاصل کی۔ حضرت شاہ محمد رحمہ اللہ سنبھلی سے بیعت ہوئے۔ اور خلافت پائی۔ متعدد کتابیں لکھیں۔ زندگی نہایت زاہدانہ اور متوکلانہ تھی۔ ۶۶ سال کی عمر میں ماہ ربیع الاول ۱۳۰۹ھ میں رہگزائے عالم بقا ہوئے۔

(حیوٰۃ العلماء، از مولانا سید محمد عبد الباقی سہوانی)

۱۲۔ قاضی محمد جمیل برہان پوری: قاضی محمد جمیل عرف بسم اللہ بن مولوی محمد عبد الغفار برہان پور میں پیدا ہوئے۔ اول حفظ قرآن کیا۔ پھر علوم مروجہ کی تحصیل مولوی قدرت اللہ، مولانا ضیاء الدین عرف اللہ والے صاحب اور مولوی میر عوض علی سے کی۔ حیدرآباد دکن پہنچے۔ خلاصۃ الحساب، فرائض شریفی وغیرہ مولوی محمد حفیظ صاحب کی خدمت میں پڑھتے رہے۔ پھر دہلی پہنچے۔ شاہ محمد اسحٰق صاحب، مفتی صدر الدین آزردہ اور مولوی اخوند شیر محمد کی خدمت میں اکتساب فیض کیا۔ نقشبندیہ و قادریہ سلسلہ میں شاہ ابو سعید مجددی سے بیعت ہوئے اور خلافت حاصل کی۔ زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے ۱۲۴۹ھ ۱۸۳۳ء میں برہان پور کے قاضی مقرر ہوئے۔ ۱۲۷۳ھ کو حیدرآباد میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

(تفصیل تاریخ برہان پور ص ۱۷۵ ص ۱۷۷ میں ہے
حاشیہ ترجمہ علمائے ہند۔ از محمد ایوب قادری ص ۴۲۳)

۱۳۔ مولانا رشید احمد گنگوہی: مولانا رشید احمد گنگوہی ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۹ء میں گنگوہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے، باپ کا نام شیخ ہدایت احمد ولد پیر بخش ہے۔ مولانا رشید احمد ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کرکے

دہلی پہنچے۔ اور مفتی صدر الدین آزردہ۔ مولانا مملوک علی نانوتوی شاہ احمد سعید مجددی اور شاہ عبد الغنی مجددی سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ مولانا رشید احمد کے سوانح نگار مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ان کا بیان نقل کرتے ہیں کہ۔

"ابتداءً ہم دہلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھتے تھے۔ لیکن تسکین نہیں ہوتی تھی۔ کبھی سبق تھوڑا ہوتا تھا اور کبھی شبہات کا جواب نہ ملتا تھا۔ مگر جب مولانا مملوک علی صاحب" کی خدمت میں پہنچے تو اطمینان ہوگیا اور بہت تھوڑے عرصہ میں کتابیں ختم کرلیں۔ گویا استاد نے گھول کر پلا دیا۔"

(مولانا رشید احمد) فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانے میں اچھے اچھے استاد دہلی میں موجود تھے مگر ایسے استاد کہ مطالب پوری طرح ان کے قابو میں ہو۔ اور انواع مختلفہ سے تقریر کر کے شاگرد کے ذہن نشین کردیں ایک ہمارے استاد مولانا مملوک العلی صاحب اور دوسرے ہمارے استاد مفتی صدر الدین صاحب تھے۔ رحمۃ اللہ علیہما۔

(تذکرۃ الرشید جلد اول ص۳۰ و ۳۱)

آپ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مرید ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں معرکہ شاملی میں شریک ہوئے۔ جس کے نتیجے میں چھ ماہ قید و بند کے شدید مصائب جھیلے۔ آپ اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی دہلی میں ایک ہی ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ دونوں جنگ آزادی میں دوش بدوش لڑے اور پھر دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور سرپرستوں میں رہے۔ ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ (تفصیل حالات تذکرۃ الرشید مرتبہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی دو جلد) میں ہے۔

۱۴۔ مولانا محمد منیر نانوتوی: مولانا محمد احسن و مولانا محمد مظہر نانوتوی کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۳۱ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم

اپنے والد حافظ لطف علی سے حاصل کی۔ پھر دہلی پہنچ کر مولانا مملوک علی نانوتوی مفتی صدرالدین آزردہ اور شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی سے جملہ علوم کی تکمیل کی مولانا محمد منیر نانوتوی صاحب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایک سرگرم کارکن اور مجاہد تھے۔ آپ جنگ شاملی میں دوسرے اکابرین کے ساتھ شریک رہے۔ اور بقول مولانا مناظر احسن گیلانی حربی سکریٹری تھے۔ اور خوب داد شجاعت دی جنگ شاملی کے بعد روپوش ہو گئے۔ معافی عام کے بعد مولانا محمد احسن کے پاس بریلی پہنچے ۱۳ مئی ۱۸۶۱ء میں بریلی کالج میں ملازم ہو گئے مطبع صدیقی بریلی کے مہتمم رہے۔ بریلی ہی سے پنشن پائی ۱۲۹۴ھ ۱۸۷۷ء کے بعد بریلی سے تعلق ختم ہو گیا۔ مولانا محمد منیر صاحب قریب دو سال دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے۔

آخر زمانے میں مطبع مجتبائی دہلی سے بھی تعلق رہا۔ امام غزالی کی کتاب منہاج العابدین کا اردو ترجمہ سراج السالکین کے نام سے کیا۔ جو کہ مطبع صدیقی بریلی سے ۱۲۸۱ھ ۱۸۶۴ء میں طبع ہوا۔ مولانا محمد منیر کی دوسری تصنیف "فوائد غریبہ" ہے۔

اس مختصر رسالے سے معلوم ہوتا ہے کہ منقولات میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ ۱۲۹۵ھ ۱۸۷۸ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ تاریخ انتقال معلوم نہ ہو سکی۔

(تذکرہ مشائخ دیوبند۔ از مفتی عزیز الرحمٰن ص ۱۶۲ تا ص ۱۶۴)

۱۵۔ مولانا خیرالدین صاحب: مولانا ابوالکلام آزاد کے والد ماجد ہیں ان کے متعلق مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا صغر سنی ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس لیے نانا کے یہاں پرورش ہوئی انھوں نے اپنے نانا اور اس عہد کے تمام مشہور اساتذہ سے تحصیل علوم کی اور تکمیل مفتی صدرالدین صاحب سے کی۔ جو علاوہ اور فنون کے فارسی و عربی کی ادبی فضیلت میں اس پائے کے عالم تھے کہ ان کے بعد پھر کوئی ویسا عالم نہ ہوا۔

ضروری علوم کی تکمیل سے وہ اٹھارہ برس کی عمر میں فارغ ہو چکے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے جب باقاعدہ درس دینا شروع کیا جس دن ان کا فاتحہ فراغ ہوا۔ اس جمعہ کو جامع مسجد میں بڑا اجتماع ہوا تھا۔ مفتی صدرالدین نے ان کے سر پر پگڑی باندھی اور شاہ عبدالغنی خانقاہ والے نے انھیں پکڑ کر مسند درس پر بٹھایا۔ چنانچہ اس دن طلبہ کی ایک جماعت نے علماء کی موجودگی میں ان سے ہدایہ اور بخاری کا درس لیا۔ اس کے بعد باقاعدہ جامع مسجد کے مدرسے میں جو ان کا خاندانی قائم کردہ تھا درس دیتے رہے۔

علمائے حرمین میں شیخ محمد طاہر وتری اور شیخ محمد مغربی کی خدمت میں رہے بالآخر شیخ محمد طاہر اس درجہ شفقت کرنے لگے کہ کچھ عرصے کے بعد اپنی بھانجی سے ان کا عقد کر دیا۔ وہابی عقائد کی رد میں ایک کتاب "نجم المبین لرجم الشیاطین" کے نام سے دس جلدوں میں لکھی۔ صرف دو جلدیں چھپ سکیں۔ اور کچھ متفرق رسائل لکھے۔

مکہ معظمہ میں نہر زبیدہ کی مرمت کے لیے ان کی کوششوں سے لاکھوں روپے چندہ جمع ہوا۔ ان کی خدمات کے صلہ میں سلطان ٹرکی کی جانب سے تمغۂ مجیدی اول ملا۔ کلکتے کی مشہور جامع مسجد ناخدا کی تعمیر بھی انھیں کی تحریک پر ہوئی ٹیپو سلطان کی مسجد کی توسیع و تعمیر میں انھوں نے حصہ لیا۔ بمبئی کے اندر پریل کے علاقے میں ایک ٹکڑا زمین خرید کر مسجد تعمیر کرائی جو آج بھی مسجد خیرالدین کے نام سے مشہور ہے۔ وعظ و خطابت کی زبردست صلاحیت تھی۔ ہزاروں کا مجمع ان کے وعظ میں شریک ہوتا۔ ان کے وعظ میں روح ڈالنے والی شے ان کا حد درجہ قلبی استغراق تھا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق و محبت ان کے تمام علمی و عملی ذوقوں کا مرکز و محور رہتا۔ باوجود انتہا درجے کی سادگی بیان کے سامعین کے دلوں پر جا کر تیر و نشتر کا کام دیتی تھی۔ پیری مریدی بھی کرتے تھے۔ ان کے معتقدین کلکتہ اور بمبئی اور ملک کے دیگر حصوں میں ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ ۱۹۰۸ء میں انتقال کیا اور کلکتہ میں مدفون ہوئے۔

(آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی بروایت ملیح آبادی)

۱۶۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی : مولانا محمد قاسم بن شیخ اسد علی ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام خورشید حسین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جدت طبع اور جودت ذہن فطری طور سے ودیعت فرمایا تھا۔ ابتدا میں شیخ نہال احمد نانوتوی، اور مولوی محمد نواز سہارنپوری سے عربی و فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں دہلی پہنچے، علوم متداولہ کی تکمیل مولانا مملوک العلی اور مفتی صدر الدین آزردہ سے کی علم حدیث مولانا احمد علی سہارنپوری اور شاہ عبد الغنی مجددی سے حاصل کیا۔ تحصیل علم سے فراغت کے بعد مدرسہ دار البقاء دہلی سے متعلق رہے۔ پھر مطبع احمدی دہلی میں تصحیح کتب کا مشغلہ اختیار کیا۔ ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء میں بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی نمایاں حصہ لیا اور معرکہ شاملی میں مجاہدین آزادی کی قیادت فرمائی۔

مولانا محمد قاسم صاحب بہت بڑے متکلم اسلام اور مناظر بھی تھے۔ عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے ان کے معرکے کے مناظرے ہوئے بڑے بڑے پادریوں اور پنڈتوں کو اپنے دلائل سے خاموش کر دیا۔ درس و تدریس میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ پہلے دہلی میں طلبہ کو پڑھایا پھر دار العلوم دیوبند کے سرپرست ہوئے۔ ان کے دم قدم سے یہ مدرسہ دینی علوم کے قیام و بقا کا بہت بڑا سرچشمہ بن گیا۔ اس کی آغوش میں سینکڑوں ایسی مقدس ہستیوں نے تربیت پائی جن کے کارنامے ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلامی کے لیے مایۂ ناز ہیں۔ ان کے شاگردوں میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا فخر الحسن اور مولانا احمد حسن امروہوی نے بڑی شہرت حاصل کی۔ تصنیفات میں (۱) مجموعۂ رسائل قاسم العلوم۔ (۲) مصابیح تراویح (۳) آب حیات، (۴) تقریر دلپذیر (۵) مباحثہ شاہجہانپور (۶) ہدایت الشیعہ (۷) قبلہ نما (۸) رسالہ حجۃ الاسلام وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔

بروز پنجشنبہ وقت ظہر چہارم جمادی الاول ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ء میں نیند اور عارضہ ذات الجنب میں انتقال فرمایا۔ اور قصبہ دیوبند میں دفن ہوئے۔

تفصیل کے لیے (۱) تذکرہ علمائے ہند رحمان علی

(۲) علمائے حق ۔ مولانا سید محمد میاں صاحب۔

(۳) سوانح قاسمی مولانا مناظر احسن گیلانی

(۴) محمد احسن نانوتوی ۔ محمد ایوب قادری

(۵) تذکرہ مشائخ دیوبند ۔ مفتی عزیز الرحمٰن

۱۷۔ نواب صدیق حسن خاں :- دولت و ثروت اور امارت و ریاست کے ساتھ علم و فضل، تقویٰ و طہارت کا جوڑ بہت کم دیکھا جاتا ہے۔ لیکن نواب صدیق حسن خاں ان مستثنیٰ ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی خدا داد صلاحیتوں کو علوم اسلامیہ کی خدمت میں لگا دیا۔ نہ صرف بیشمار تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں بلکہ اسلاف کی نایاب کتابوں کو بھی شائع کر کے انھوں نے ملت اسلامیہ کے علمی و دینی سرمایہ میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

نواب صدیق حسن خاں کا اصل وطن قنوج یوپی ہے۔ ان کے والد مولانا سید آل حسن قنوجی بخاری کا تعلق تحریک مجاہدین سے تھا۔ وہ خود ایک بڑے عالم تھے۔ نواب صاحب ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء میں قنوج میں پیدا ہوئے۔ پیدائش سے پہلے ہی والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ ابتدائی نحو و صرف کی کتابیں پڑھ کر دہلی مفتی صدرالدین صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ اور اپنی غیر معمولی ذہانت و فطانت اور بے مثل قوت حافظہ کی بدولت علوم متداولہ رسمیہ کی تمام کتابیں صرف ایک سال آٹھ مہینے میں ختم کیں۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب "اتحاف النبلا" میں خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ تحصیل علم کے بعد مفتی صاحب نے جو انھیں اجازۃً سند مرحمت فرمایا اسے بھی انھوں نے نقل کیا ہے۔ انھوں نے خود

اپنی خود نوشت سوانح عمری "ابقاء المنن بالقاء المحن" میں اپنے حالات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

مفتی صدر الدین صاحب کے علاوہ انھوں نے قاضی حسین بن محسن انصاری، شیخ عبدالحق بن فضل اللہ دہلوی، شیخ محمد یعقوب دہلوی اور مولانا محمد اسحٰق دہلوی سے بھی استفادہ علمی کیا۔ اور ہر ایک سے سند اجازت لی، کتابوں کے مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ رئیسہ بھوپال نواب شاہجہاں بیگم سے ۱۲۸۸ھ میں ان کا نکاح ہوا۔ اور نوابی و خان کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ ان کے دم قدم سے بھوپال دارالاقبال بن گیا۔ اور اسے علمی مرکزیت حاصل ہوگئی۔ دوسری بیوی سے ان کے بیٹے نواب نورالحسن خاں، اور نواب علی حسن خاں صاحب علم و ثروت تھے اور انھوں نے بھی کئی کتابیں لکھیں۔ نواب نے اردو۔ فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں کتابیں لکھیں جو بھوپال مصر اور قسطنطنیہ سے شائع ہوئیں اور تقریباً ساٹھ سے اوپر ہیں۔ لیکن (۱) ابجد العلوم (۲) اتحاف النبلاء (۳) فتح البیان فی مقاصد القرآن (۴) فتح المغیث بفقہ الحدیث (۵) التاج المکلل (۶) تقصار فی جیود الاحرار (۷) مسک الختام شرح بلوغ المرام (۸) عون الباری بحل ادلۃ البخاری (۹) رحلۃ الصدیق الی بیت العتیق (۱۰) تذکرہ شمع انجمن ان کی بڑی مشہور کتابیں ہیں۔ اور ہر کتاب سے ان کے تبحر علمی اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

نواب صدیق حسن خاں نے جمادی الثانی شب پنجشنبہ ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء میں وفات پائی اور بھوپال میں دفن ہوئے۔

تفصیل۔ ۱۔ اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین

۲۔ ابقاء المنن بالقاء المحن

۳۔ مآثر الامرائی نواب علی حسن خاں

۴۔ تذکرہ علمائے ہند۔ رحمان علی

مولوی سمیع اللہ خاں :۔ مولوی سمیع اللہ خاں بن منشی عزیز اللہ ۱۸۳۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور مولوی سید محمد اور مولانا مملوک علی سے ان کے گھر پر تعلیم حاصل کی۔ مفتی صدر الدین آزردہ سے بھی پڑھا۔ نومبر ۱۸۵۶ء میں منصفی اور وکالت کا امتحان پاس کیا۔ اور کانپور میں منصف مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۴ء تک آگرہ کی صدر دیوانی، صدر نظامت، اور ہائی کورٹ میں وکالت میں وکالت کی۔ ۱۸۷۳ء میں صدر الصدور مقرر ہوئے۔ علی گڑھ۔ الہ آباد۔ مراد آباد اور فتح گڑھ میں کارفرما رہے۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جو ملکہ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا ایک جلسہ میں بصدارت مولوی محمد کریم ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ۔ مدرسہ علی گڑھ کے افتتاح کی رسم ادا کی گئی۔ مولوی صاحب نے میو سنٹرل کالج الہ آباد کے مسلم طلبہ کے لیے الہ آباد میں ایک بورڈنگ ہاؤس بنوایا جس کا افتتاح سر آکلینڈ کالون لفٹنٹ گورنر یوپی کے ہاتھ سے ۱۱ مارچ ۱۸۹۲ء کو کرایا۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۸۲ء کو مولوی سمیع اللہ مصر میں انگریزوں کے استعمار کو مضبوط کرنے کی غرض سے پولیٹیکل مشن پر مصر گئے۔ اور وہاں انھوں نے جمال الدین افغانی کی تحریک کو نقصان پہنچایا۔ ان خدمات کے صلے میں ان کو سی، ایم، جی کا خطاب ملا۔ ۵ ربیع الاول ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۷ اپریل ۱۹۰۸ء کو دہلی میں فوت ہوئے۔ (سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خاں۔ از مولوی ذکاء اللہ دہلوی)

۱۹۔ مولانا حاجی ضیاء الدین :۔ مولانا حاجی شیخ محمد ضیاء الدین حنفی قادری کے والد ماجد داروغہ محمد بخش تھے دہلی کے موضع بسئی پور کے رہنے والے تھے۔ مولانا مملوک العلی نانوتوی اور مفتی صدر الدین صاحب سے تعلیم پائی۔ دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ ۱۸۶۳ء میں عربی کے مددگار پروفیسر، اس کے بعد پروفیسر مقرر ہوئے۔ دہلی کالج کے ٹوٹنے کے بعد ۱۸۶۷ء میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری پر

مامور ہوئے۔ پھر شمس العلماء کا خطاب اور ایل ایل ڈی کا اعزاز پایا۔ امتحانات منشی فاضل، مولوی فاضل کے ممتحن ہوتے رہے۔ پنشن لے کر چاہ رہٹ نزد جامع مسجد میں سکونت اختیار کی۔ عبادت میں سختی سے اوقات کے پابند رہے۔ انگریزی فوجیوں کے ادنیٰ و اعلیٰ طالب علموں کے لیے انشائے اردو (۴ حصے) کچہری کے اہل کاروں کے لیے معترضۃ العلمہ۔ اور مدارس انگریزی کے لیے منتخبات اردو۔ مفتاح الارض۔ رسالہ علم طبیعات۔ آپ کی یادگار ہیں۔ مسلم الادب کا ترجمہ۔ اور "رسوم ہند" بھی آپ ہی کی کتاب ہے۔ عیار شمسی کے نام سے دیوان حافظ کی شرح بھی لکھی ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۹ء زیارت حرمین شریفین کے لیے گئے۔ مکہ معظمہ میں فوت ہوئے (رعنا یا جمیل ۱۵)

۲۰۔ نواب محمد علی خاں بہادر جہانگیر آبادی رشکی: نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد عالی مقدار کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ سے عربی پڑھی۔ بعد میں انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں بھی کافی دستگاہ پیدا کر لی تھی۔ جس زمانے میں حالی جہانگیر آباد میں تھے۔ یہ بھی ان کی اتالیقی میں رہے۔ اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد جاگیر کے وارث ہوئے۔ سرکار انگریزی میں ان کی آؤ بھگت تھی۔ چنانچہ ضلع بلند شہر میں انھیں مجسٹریٹی کے اختیارات حاصل تھے۔ ۱۸۹۰ء میں صوبجات متحدہ کی طرف سے وائسرائے کی کونسل کے ممبر نامزد ہو گئے۔ پانچ سال بعد ۱۸۹۵ء میں خان بہادری اور نوابی کے خطاب ملے۔ نواب سر حامد علی خاں والیٔ رامپور کے زمانۂ نابالغی میں انھیں انتظام ریاست میں مدد دینے کے لیے ایک کونسل مقرر ہوئی تھی جس میں محکمۂ مال (ریونیو) کے ممبر خاں بہادر سید علی حسن تھے۔ انھوں نے بعارضۂ تپ دق اپریل ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا تو ان کی جگہ نواب صاحب موصوف نے سرکار انگریزی کی منظوری سے نواب محمد علی خاں رشکی کو اپنی کونسل کا ممبر مقرر کر دیا۔ اس عہدے کی تنخواہ بارہ سو روپے ماہانہ تھی یہ ۴ مئی ۱۸۹۵ء کو اس

عہدہ پر متمکن ہوئے۔ یکم جون ۱۸۹۶ء کو یہ کونسل ٹوٹ گئی اور نواب صاحب بہادر کو اختیارات کاملہ حاصل ہوئے۔ چنانچہ رشکی بھی اس عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد ان کے چھوٹے سوتیلے بھائی نواب محمد اسحٰق ریاست میں مدار المہام ہو کر تشریف لے گئے۔

رشکی ۲۰ مئی ۱۸۹۹ء (۹ محرم ۱۳۱۷ھ) کو کار بنکل سے لاولد فوت ہوئے۔ اپنے والد گرامی کے پہلو سلطان جی میں مدفون ہیں۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ یہ مشہور شعر انھیں کا ہے۔

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

(تلامذۂ غالب مالک رام ص ۱۰۷ تا ص ۱۱۹)

۲۱۔ حکیم عبد المجید خاں رام پوری: حکیم عبد المجید خاں ولد معز الدین ولایتی ملا عرفان کی مسجد کے قریب رہتے تھے۔ رام پور ہی میں پیدا ہوئے۔ معقول مولانا خلیل الرحمٰن خاں سے پڑھی۔ دہلی جا کر مفتی صدر الدین خاں سے فقہ و اصول وغیرہ پڑھا۔ حدیث مولانا محمد یعقوب برادر مولانا محمد اسحٰق سے حاصل کیا۔ حکیم حسین بخش خاں ملازم شاہ دہلی سے طب پڑھی۔ دہلی میں مفتی صدر الدین خاں بحالت طالبعلمی ان کے کھانے کے کفیل تھے۔ سبق ناغہ ہونے کا واقعہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے تکمیل کے بعد رات دن پڑھانے اور مطب کرنے کا شغل تھا۔ بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچا۔ رام پور میں کچھ دنوں صاحبزادہ کاظم علی خاں بہادر برادر نواب فردوس مکاں اور صاحبزادہ محمد رضا خاں بہادر کے ہاں ملازم رہے پھر دتاولی ضلع بلند شہر کو چلے گئے۔ وہاں سے بیمار ہو کر آئے اور رام پور میں ۱۲۸۹ھ کے قریب انتقال ہوا۔

(تذکرہ کاملان رام پور مولفہ حافظ احمد علی خاں شوق رامپوری ص ۱۴۲، ۲۴۳)

۲۲۔ مولانا سید قطب الدین دلاور علی جعفری طرزی: دلاور علی نام، اور قطب الدین لقب تھا۔ یہ بیٹے تھے سید امداد علی بن اللہ بخش بن سید اویس بن سید محمد بن سید عبدالکریم کے۔ ان کے دادا سید اولاد علی بلند شہر میں وکیل سرکار تھے۔ طرزی بلند شہر ہی میں پیدا ہوئے۔ اور ان کی ابتدائی تعلیم بھی اسی جگہ ہوئی۔ جب یہاں سے فارغ ہوئے تو تکمیل کے لیے دہلی پہنچے۔ اور مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور سے منطق اور ریاضی۔ اور مولانا مملوک علی نانوتوی سے حدیث اور ادب عربی اور مولوی سدید الدین سے فارسی پڑھی۔ درسیات متعارفہ کے علاوہ طب اور مصوری اور خوشنویسی میں بھی مہارت پیدا کی۔ طب حکیم امام الدین خاں سے پڑھی۔ خوشنویسی میں میر پنجہ کش کے شاگرد تھے۔ فن سپہ گری کے بھی ماہر اور خصوصاً بنوٹ کے بھی استاد تھے۔ دہلی میں تعلیم ختم کرنے کے بعد ہاپوڑ کے سرکاری اسکول میں صدر مدرس ہوئے۔ ریاضیات میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس سے مستعفی ہو کر لکھنؤ میں بندوبست کے ناظر اول مقرر ہو گئے۔ جب سید امداد علی کا انتقال ہوا تو اپنے والد کی جگہ الور میں سر رشتہ دار کلکٹری مقرر ہوئے۔ یہاں سے تحصیلدار ہو کر رام گڑھ گئے اور آخر میں ترقی کر کے ۱۸۸۷ء میں ریاست کے چیف مجسٹریٹ ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں ملازمت سے پنشن لی۔ اور اس کے بعد مستقلاً ہاپوڑ میں رہنے لگے۔ یہیں چند روز بعارضۂ بخار علیل ہو کر ۲۸ ستمبر ۱۹۱۱ء ۵ شوال ۱۳۲۹ھ کو واصل بحق ہوئے۔

مفتی صدرالدین آزردہ ہی کے واسطے سے غالب، صہبائی، شیفتہ اور دوسرے اساتذۂ وقت سے مراسم پیدا ہوئے۔ آغاز میں ثاقب تخلص کرتے اور آزردہ سے اصلاح لیتے رہے۔ استاد نے ثاقب بدل کر طرزی تخلص کر دیا۔ (تذکرۂ یادگار ضیغم میں نام ثاقب ہی کے تحت ہے) غالباً اسی زمانے میں غالب سے مشورہ کرنے لگے۔ اردو میں کچھ نہیں کہا۔ فارسی میں دو دیوان ان کے یادگار ہیں۔ ریاضیات میں ایک کتاب

تہذیب اقلیدس ہے۔ (تلامذہ غالب۔ مالک رام ص۲۰۳ تا ص۲۰۶)

۲۳۔ مولانا حکیم سید محمد حسن امروہوی: حضرت مولانا سید محمد حسن صاحب (۱۲۴۹ھ تا ۱۳۲۳ھ)، جید عالم اور زاہد و عالم بزرگ تھے۔ فلسفہ مشائیہ اور علوم عقلیہ میں مولانا فضل حق خیرآبادی کے۔ علوم نقلیہ، حدیث و تفسیر و فقہ میں مفتی صدرالدین دہلوی کے شاگرد تھے۔ علم طب حکیم امام الدین دہلوی سے حاصل کیا تھا۔ عرصہ تک گورنمنٹ کالج اجمیر میں عربی و فارسی کے پروفیسر رہے۔ آخر زمانہ میں ملازمت کی پابندیوں سے آزاد ہو کر اجمیر میں مطب کرنے لگے تھے۔ اپنے وطن امروہہ میں وصال فرمایا۔

حکیم صاحب نے کتب سماوی کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا تھا۔ انجیل و زبور پر کامل عبور تھا۔ علم تصوف سے خاص دلچسپی تھی۔ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اور شیخ اکبر کے خیالات کی وضاحت اپنی تصانیف میں کی ہے۔

مدت العمر تصنیف و تالیف کا مشغلہ رہا۔ ان کی تہتم بالشان تصنیف تفسیر القرآن ہے جو ۱۲۹۵ھ میں مطبع میرحسن دہلوی سے "تفسیر شاہی معالمات الاسرار فی مکاشفات الاخیار" کے نام سے فارسی زبان میں شائع ہوئی تھی۔ پھر دوبارہ اردو زبان میں شائع ہوئی تھی۔ پھر دوبارہ اردو زبان میں "غایت البرہان فی تاویل القرآن" کے نام سے بھی چھپی۔ ان کی دیگر تصانیف یہ ہیں:

(۱) کواکب دریہ (۲) معراج رسول (۳) اتمام حجت اسلام در شرح دانیال علیہ السلام (۴) حقانیت اسلام (۵) تلخیص النواریخ ملقب بہ مفرح دلکشا (۶) رسالہ آگہی نامہ (۷) درنایاب (۸) گنجینہ اسرار انبیا (۹) کشف الاسرار (۱۰) نگینہ حکمت در شرح فصوص الحکم شیخ اکبر۔ (۱۱) آفتاب عالمتاب

(تاریخ مشائخ چشت۔ خلیق احمد نظامی ص۶۹۸ تا ص۶۹۹)

۴۲ مولانا ذوالفقار علی دیوبندی :- مولانا ذوالفقار علی دیوبندی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کے والد بزرگوار ہیں۔ صاحب "گل رعنا" اور دوسرے تذکروں نے مولانا ذوالفقار علی صاحب کو بھی مفتی صدرالدین صاحب کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔

آپ دیوبند کے عثمانی شیوخ میں سے شیخ فتح علی کے صاحبزادے تھے۔ دہلی کالج میں تعلیم کے لیے گئے مولانا مملوک علی سے اکتساب علم کیا۔ غالباً اسی وقت مفتی صاحب سے بھی استفادہ کیا ہوگا۔

مولانا ذوالفقار علی صاحب نے اپنی علمی صلاحیتوں کی وجہ سے بہت جلد ترقی کرلی تھی۔ چنانچہ وہ انسپکٹر مدارس بنادیے گئے۔ مدرسہ دیوبند اور اس کے کاموں میں حاجی عابد حسین صاحب کے ہمنوا اور مشیر کار رہے۔ عربی ادب کا بڑا اونچا مذاق رکھتے تھے۔ چنانچہ عربی دواوین کی متعدد شرحیں لکھیں۔

آج بھی ان کی کتابیں عربی مدارس کے طلبہ کے لیے معین و مددگار رہیں آپ کا انتقال ۱۳۲۲ھ میں ہوا اور آپ نے یادگار میں ۶۰ افراد ذکور واناث اور متعدد کتابیں چھوڑیں تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) عطر الوردہ - قصیدہ بردہ کی اردو شرح (۲) الارشاد - قصیدہ بانت سعاد کی شرح (۳) التعلیقات. سبع معلقہ کی شرح (۴) تسہیل الدراسہ دیوان حماسہ کی اردو شرح (۵) تسہیل البیان - دیوان متنبی کی اردو شرح (۶) معیار البلاغت کی اردو زبان میں علم معانی و بیان میں لاجواب کتاب (۷) الہدیۃ السنیہ مدرسہ دیوبند کی تاریخ۔

اولاد میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب، مولانا حامد حسن صاحب، مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور مولانا محمد محسن صاحب تھے۔

(تفصیل تذکرہ شیخ الہند مولفہ مفتی عزیز الرحمٰن - ۲ حیات شیخ الہند)

۲۵۔ مولوی عبدالسمیع بیدل رامپوری: فارسی اور عربی کی علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ سنہ ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) میں کسب علم کے لیے دہلی آئے۔ اور مفتی صدر الدین خاں سے عربی پڑھی، انہی ایام میں شعر گوئی کا شوق ہوا تو میرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اوائل عمر میں طبیعت غزل کی طرف زیادہ مائل رہی۔ بعد میں اس رسمی شاعری کو چھوڑ کر اپنی تمام توجہ مذہبی علوم و مسائل پر محدود کر دی۔ ایک نعتیہ دیوان اور ایک مختصر رسالہ نور ایمان کے نام سے موجود ہے جس میں مختلف دینی مسائل نظم کیے ہیں۔

(تلامذۂ غالب۔ مالک رام)

۲۶۔ مولوی انوار الحق دہلوی:۔ مولوی شاہ انوار الحق دہلوی نے مولانا مملوک علی اور مفتی صدر الدین صدر الصدور دہلوی سے تعلیم پائی۔ مدتوں ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ کے میر منشی رہے۔ نہایت نیک نامی اور ذمہ داری سے اس خدمت کو انجام دیا۔ کافی عرصے تک ریاست بھرتپور کی وکالت پر بھی رہے "دہلی یا الجمیل" میں ہے کہ "نہایت خلیق، منکسر المزاج، نازک خیال، شیریں مقال پاکیزہ صورت تھے۔ فارسی، عربی وغیرہ علوم میں برجستگی و قابلیت کے علاوہ حافظہ و فہم و ذکا میں گویا نفسی ثانی تھے۔ خصوصاً فن تاریخ میں اپنے خداداد حافظہ کے لحاظ سے شاہجہاں آباد دہلی میں فرد تھے" آپ کی مشہور تصانیف "اقتباس الانوار" اور "حشی چمن" ہے۔ بھرت پور کی ملازمت کے بعد پنشن یافتہ ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔

جمعرات کے دن ۱۵۔ رمضان المبارک سنہ ۱۳۲۰ھ کو فوت ہوئے۔ (دہلی کی یادگار ہستیاں۔ امداد صابری ص ۱۶۹)

۲۷۔ مولوی فقیر محمد جہلمی:۔ مولوی فقیر محمد بن حافظ محمد سفارش بن منع عثمان

کے رہنے والے تھے۔ جو شہر جہلم (پاکستان) سے دو میل مغرب کی جانب ہے جمعرات کے روز ۱۲۶۱ھ ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ رسمی و مروجہ علوم کی تحصیل میاں قطب الدین ٹالیاں والہ۔ میاں غلام محمد ساکن موضع جاوہ۔ مولانا نور احمد صاحب کہائی ٹولہ۔ مولوی عبدالکریم صاحب مفتی شاہ پور۔ مولوی محمد حسن فیروز والا سے کی۔ اور ۱۲۷۲ھ میں دہلی آئے۔ جبکہ مفتی صاحب کا آخری دور تھا اور اپنے خاندانی مکان سے اٹھ کر بستی نظام الدین اولیاء میں مقیم تھے۔ چنانچہ مولوی فقیر محمد صاحب اپنی خود نوشت سوانحعمری میں لکھتے ہیں۔

"ایک فوج کے ساتھ جو کانپور کو جاتی تھی دہلی پہنچا۔ پہلے پہل پنجابی کٹرہ میں مولوی نذیر حسین صاحب کے درس میں حاضر ہوا۔ مگر انھوں نے یہ عذر کر کے کہ ہم معقولات نہیں پڑھا سکتے۔ مولوی محمد شاہ صاحب مصنف مدار الحق کے سپرد کر دیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد بستی نظام الدین اولیاء میں جناب صدر الافاضل، اعز المماثل مولانا مفتی محمد صدر الدین خاں صاحب صدر الصدور دہلی تلمیذ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں چلا گیا۔ جن کے درس میں تقریباً ڈیڑھ سال رہ کر قراۃً و سماعاً کتب درسیہ و متداولہ کا عبور کیا۔ اور اواخر ۱۲۷۳ھ میں وہاں سے مراجعت کر کے اپنے وطن مالوف میں آیا۔

پھر لاہور میں آگئے۔ وہاں حافظ ولی اللہ لاہوری کی صحبت میں رہ کر عیسائیت کی تردید کا جذبہ پیدا ہوا۔ فارسی کتاب "تصدیق المسیح" کا اردو میں ترجمہ کیا مبانتہ الانسان عن وسوستہ الشیطان پر حاشیہ لکھا۔ زبدۃ الاقاویل فی ترجیح القرآن علی اناجیل اور رسالہ آفتاب محمدی کتابیں لکھیں۔ آفتاب پنجاب کے نام سے اخبار جاری کیا۔ اپنے لخت جگر کے نام پر مطبع سراج المطابع قائم کیا۔ تصانیف میں "تذکرہ حدائق الحنفیہ" کو زیادہ شہرت ملی۔

(تفصیل۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۹۲ تا ص ۴۹۶)

تلامذۂ سخن: یہ تو تھے مفتی صاحب کے وہ مخصوص تلامذہ جنھوں نے علوم درسیہ میں آپ سے استفادہ کیا یا ان کی تکمیل کی۔ علمی، ادبی، مذہبی اور گوناگوں لحاظ سے خاص شہرت کے مالک ہوئے۔ ان کے علاوہ آپ کے شاگردوں میں کچھ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ جنھوں نے شعر و سخن میں آپ سے اصلاح کی یا مشورہ کیا۔ بعض تذکروں میں ان تلامذۂ سخن کا بھی ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ ان کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۲۸- اشکی:۔ مرزا غلام محی الدین اشکی عرف مرزا ممّن کے والد مرزا غلام حیدر تھے۔ اور حضرت شاہ عالم مرحوم کے آپ نواسے تھے۔ قلعہ دہلی میں رہتے تھے۔ شروع میں فخر الشعراء میر نظام الدین ممنون سے مشورہ کرتے تھے۔ اس کے بعد مفتی محمد صدر الدین صاحب آزردہ سے استفادہ کیا۔ خوش فکر۔ طبع رسا تھے۔ ذہن سلیم تھا۔ اطوار حمیدہ۔ عادات پسندیدہ۔ ان کی ذات میں پائی جاتی تھی۔ قد لمبا تھا۔ سفید پوش رہا کرتے تھے۔ صورت پر ثقہ پن برستا تھا۔ ۱۲۶۱ھ میں ان کی عمر چالیس برس کی تھی۔ شہزادوں کے ساتھ غدر میں شہید ہوئے آپ کے کلام میں خاص لطف پایا جاتا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

کب دل سے چھٹے عشق تری زلف دوتا کا — دام ازلی وہ۔ یہ گرفتار سدا کا
کیا پاس کسی کا ہے کہ مرتا ہوں ولیکن — شکوہ نہیں کرتا شب ہجراں کی جفا کا
مسجد میں گرے دیکھ کے تصویر بت اشکی — معلوم ہوا آپ کا خرقہ تھا ریا کا

(سخن شعراء ص ۳۱۔ طبقات الشعراء ص ۲۲۴۔ خمخانہ جاوید ص ۳۲)

۲۹- تاب: آزردہ اپنے تذکرہ شعرائے ریختہ میں لکھتے ہیں۔

''تاب تخلص . مہتاب رائے از قوم پنڈت است . خوش فکر گاہ گاہ اشعارِ خود بملاحظہ راقم حروف در آوردہ . از دست ؎

قاصد ابھی میں خط غلامی تجھے لکھ دوں — وہ آئے ہیں آ کر جو کہے تو خبر ایسی
مکھڑا دہ ستم . زلفِ سیہ فام وہ کافر — کیا خاک جئے کوئی کہ شب ایسی سحر ایسی
یا تنگ نہ کر ناصح ناداں ! مجھے اتنا — یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی
رہ جائے مسیحا بھی آ اوس کے سرہانے — کچھ آن بنی ہے ترے بیمار پر ایسی

مختار الدین صاحب آرزو حاشیے میں لکھتے ہیں .

ان میں سے دوسرا ، تیسرا اور چوتھا شعر خود مفتی صدرالدین آزردہ کی طرف منسوب ہیں (گلشن ہمیشہ بہار ص ۵۳) لیکن یہاں آزردہ خود ان اشعار کا خالق اپنے ایک شاگرد کو بتاتے ہیں . شعر ۳ گلشن ہمیشہ بہار (ص ۹۲) گلشنِ بے خار (ص ۳۹) تذکرہ کریم الدین (ص ۲۶۷) اور سخن شعراء (ص ۸۰) میں تاب کی طرف منسوب ہیں ان تذکروں میں اس زمین کا ایک اور شعر ؎

خو ہوتی ہمیشہ سے تمہاری اگر ایسی — تو کاہے کو تھمتی مری اے فتنہ گر ایسی

بھی تاب کی طرف منسوب ہے یہ شعر گنج شائگاں . مولفہ سید الطاف حسین کاظم دہلوی (لاہور ۱۸۹۳ ع) میں آزردہ کی طرف منسوب ہے

مولوی عبدالقادر خاں چیف وقائع عبدالقادر خانی میں لکھتے ہیں . یہ جس وقت بندہ نے ان کو دیکھا ہے ان کی توجہ اشعار ریختہ و فارسی کی طرف مطالعہ کتب علمیہ سے زیادہ تھی ان کا یہ شعر مجھے یاد ہے .

یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا — یا مجھ کو دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

ایک دوسرے شخص کی زبان سے ایک شعر اسی غزل کا سنا جو خود کی طرف نسبت کرتا تھا ؎

مکھڑا دہ بلا . زلف سیہ فام دہ کافر — کیا خاک جئے جس کی شب ایسی سحر ایسی

میری رائے میں یہ دونوں شعر ایک ہی شخص کا کلام نہ ہوں . مگر دوسرے کے منہ پر ہاتھ نہیں رکھا جا سکتا ''

(علم و عمل ص ۲۷۵) رسالہ تحریر سہ ماہی . جلد ۴ . شمارہ ۴)

۳۴۔ شہرت : صاحب عالم میرزا حاجی خلف مرزا قیام ابن شاہ عالم بادشاہ شروع میں حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان اور نظام الدین ممنون سے اصلاح لی۔ ان کی وفات کے بعد مفتی صدرالدین خاں آزردہ کو غزل دکھائی۔ ۱۲۶۱ھ میں تئیس برس کا سن تھا۔ غدر سے پہلے انتقال کیا۔ مرثیہ گو اور صاحب دیوان تھے۔ کلام میں تازگی ہے۔ اسلوب برجستہ اور تخیل اعلیٰ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

ہم بڑی چیز سمجھتے تھے یہ میخانے میں — نکلا اک جام کی قیمت بھی نہ ایماں اپنا
غبار اٹھا نہ ترے دل سے ورنہ اے ظالم — ہماری جان کو اک یہ بھی آسماں ہوتا
ہائے جی بھر کے وہ دیدار میسر نہ ہوا — حشر کا دن شب غم کے بھی برابر نہ ہوا

(خمخانہ جلد پنجم ص ۱۹۰ و طور کلیم ص ۵۸)

باب ۱۱

تصنیفات

مفتی صدر الدین آزردہ نے اپنے دل و دماغ کی خداداد نعمتوں اور مطالعہ و محنت سے حاصل کی ہوئی ساری علمی و فکری صلاحیتوں کو صرف ایک مقصد کے لیے وقف کر دیا تھا اور وہ تھا طالبان علم و فن کو فیض پہنچانا۔ وہ فرائض منصبی کے بعد تمام عمر بغیر معاوضہ و اجرت معقولات و منقولات اور ادبیات کا درس دیتے رہے۔ اور اس مشغلے سے انھیں بہت کم فرصت ملی کہ باقاعدہ تصنیفی کاموں کی طرف پوری توجہ دے سکیں۔ پھر بھی جب انھیں کبھی موقع ملا تو ان کے قلم نے کوتاہی نہیں کی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے تصنیفی کارنامے باقی نہیں رہے۔ ان کی قلمی یادگاریں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہو گئیں اور جو باقی رہیں ان کا دستیاب ہونا بہت دشوار ہے۔ تلاش و تحقیق کے بعد ان کی جن تصنیفات کا سراغ لگ سکا ان میں سے کچھ کا اجمالی اور کچھ کا تفصیلی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

مولوی کریم الدین پانی پتی "تذکرہ فرائد الدہر" میں لکھتے ہیں کہ

(۱) "ان کی تصنیفات میں سے ایک حاشیہ "قاضی مبارک" کا ہے مگر وہ ایام طالب علمی کی شاید تصنیف ہے۔ کیونکہ ایسا ہی ان کی زبانی سننے میں آیا ہے۔ اور اکثر رسالے اور فتوے ان کی تصنیف سے ہیں اور ہر روز جو مسائل لکھے جاتے ہیں ان کا کچھ شمار نہیں۔

(۲) ایک کتاب صنائع اور بدائع میں انھوں نے تصنیف کرنی شروع کی تھی مگر معلوم نہیں وہ تمام ہوئی یا نہیں، اگر یہ کتاب تمام ہو کر چھپ جائے گی تو تمام

خاص اور عام کو فائدہ کثیر حاصل ہوگا۔ ''فرائد الدہر ص ۳۹۶''

(۳) مولانا احتشام الحسن کاندھلوی ''تذکرہ مشائخ کاندھلہ'' میں مولانا نورالحسن کے حالات میں لکھتے ہیں کہ جس زمانے میں مفتی صدرالدین سے مولانا نورالحسن پڑھتے تھے تو مفتی صاحب نے ''میر زاہد'' پر حاشیہ لکھا تھا۔ اور مولانا نورالحسن نے اسے نقل کیا تھا۔

(۴) ایک تحریر رسالہ ''امتناع نظیر'' پر تھی جس کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیرالدین نے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے بھی ''تذکرۃ الخلیل'' میں ضمنی طور پر اس رسالے کا نام لیا ہے۔

(۵) مولانا خیرالدین کی جو روایت غلام رسول مہر نے اپنی کتاب ''غالب'' میں درج کی ہے اس میں انھوں نے ''دیوان متنبی'' کی شرح لکھنے کا بھی ذکر کیا ہے۔

(۶) ''در المنضود فی حکم امراۃ المفقود'' کا ذکر نواب صدیق حسن نے ''اتحاف النبلا'' فقیر محمد جہلمی نے ''حدائق الحنفیہ'' میں اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی کیا ہے۔ مگر اب ناپید ہے۔

یہ تو تھیں وہ کتابیں جن کا کہیں پتہ نہیں چلتا ان کے علاوہ ان کی دو کتابوں کو بڑی تلاش و جستجو کے بعد برآمد کیا گیا ہے اس لیے ان کے متعلق ذرا تفصیل سے تعارف کرایا جاتا ہے۔

(۷) تذکرہ شعرائے ریختہ۔

سب سے پہلے اس کتاب کا ذکر شیفتہ کی ''گلشن بیخار'' میں ملتا ہے۔ سودا کے ترجمہ میں استطراداً لکھتے ہیں۔

''اشعار منتخب ایشاں (سودا) باید نگریست کہ درجہ رتبت عالی و مکانت ضخیم جلوہ ظہور گرفتہ دیدل علی ذالک ما قال شرف

الاناضل، فخر الاماثل، قدوۃ المحققین، مولانا محمد صدر الدین
المتخلص بہ آزردہ در تذکرہ خود کہ بایجاز و اختصار تمام در حال ارباب
نظم ریختہ نوشتہ است، تحت ترجمہ میر تقی المتخلص بہ میر در شرح
کلام وے حیث قال۔

"پستش اگرچہ اندک پست است۔ اما بلندش بسیار بلند"

اس سے معلوم ہوا کہ آزردہ نے ایک تذکرہ شعرائے اردو بھی مرتب کیا
تھا لیکن اور کسی نے استفادے کا ذکر نہیں کیا۔ بظاہر یہ ضائع ہو گیا۔ لالہ سری رام
نے بھی لکھا ہے کہ ایک تذکرہ شعرائے ریختہ ان کی یادگار ہے مگر نایاب ہے" خمخانۂ
جاوید-۱-۵۵) نواب نور الحسن خاں نے "طور کلیم صـ ۱۰۳" میں بھی اس
کا ذکر کیا ہے۔

لیکن مشہور محقق جناب مختار الدین آرزو لائق مبارکباد ہیں کہ انھیں اس
تذکرے کا کچھ حصہ دستیاب ہو گیا۔ ابتدائی ۴۴ صفحات کا ایک خطی نسخہ کسی طرح
کورپس کرسٹی کالج، کیمبرج (انگلستان) کے کتاب خانے میں پہنچ گیا۔ مخطوطہ نمبر ۱۵۹
اور یوں دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گیا۔ آرزو صاحب اپنے ساتھ اس کا عکس
لائے ——— اور نہایت تفصیل سے اس کا تعارف کرایا اور اس
نسخہ کی خصوصیات لکھیں۔ دوسرے تذکروں سے ملا کر اس پر حاشیے لکھے اور
اسے علمی مجلس دلی کے تماہی رسالہ "تحریر" میں شائع کیا۔

آرزو صاحب لکھتے ہیں کہ

"آزردہ نے یہ تذکرہ ۱۲۲۹ھ اور ۱۲۳۳ھ کے درمیان زمانے میں مرتب
کیا تھا جب کہ ان کی عمر ۲۵ یا ۳۰ سال کی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ بقول شیفتہ "ایجاز و اختصار" کی صفات اپنی جگہ، لیکن
اس تذکرے سے کسی جگہ بھی ہمارے علم میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ غائر مطالعے
سے معلوم ہوتا ہے کہ آزردہ نے اس کی ترتیب و تالیف میں مصحفی کے تذکرہ ہندی

اور قاسم کے مرتبہ مجموعۂ نغز پر انحصار کیا ہے۔ اور ستم یہ کیا ہے کہ جہاں ان دونوں تذکروں میں مزید معلومات بھی موجود تھیں انھیں نظری کر دیا ہے۔ بیشتر مقامات پر لفظ ترتیب واقعات بھی ان دونوں تذکروں کے مطابق نہیں۔ بلکہ الفاظ و تراکیب بھی یکساں ہیں۔ بہت شاذ صورتوں میں انتخاب اشعار بھی ان دونوں ماخذ کے علاوہ کسی اور جگہ سے ہے۔ یہی بات فہرست شعراء سے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ ان دونوں تذکروں کے بعد کسی حد تک عمدہ منتخبہ (سرور) اور عیار الشعراء (ذکا) سے استفادے کے آثار بھی ملتے ہیں۔

تذکرے سے کسی خاص تنقیدی شعور کا بھی پتا نہیں چلتا۔ بیشتر شعراء کے لیے مروج ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں۔ اشعار با مزہ و خوش ادا (احسان) طبیعتے ہموار (اسد) نہایت بامزہ حرف میزند (آشفتہ) طبعش خالی از لطافت نیست (اوباش) فکرش بلیغ و نظمش فصیح (برکت) اشعار بلند مرتبہ (بقا) اشعار خوب و دلفریب (بیان) وغیرہ

ظاہر ہے کہ اس سے نہ خود مصنف کا کوئی معیار تنقید قائم ہوتا ہے۔ نہ شاعر کے کلام ہی کی کسی خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ رسمی تنقید و تعریف صرف ہمارے مشرقی تہذیب و تمدن کی وضعداری کا مظاہرہ ہے اور بس۔ دو مقامات پر البتہ ایسے فقرے ملتے ہیں جن سے آزردہ کی آزادہ روی کا کچھ نقش ابھرتا ہے۔ میر محمدی بیدار کے حالات میں لکھتے ہیں۔ گاہ گاہ اشعار خوب ہم از وے سر زد۔ دوسری جگہ ظفر کے تذکرے میں ایک فقرہ ہے اشعار بسیار دارد۔ گاہے ابیات درست ہم از طبعش سر میزند۔ یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس دوسرے اقتباس میں لفظ "درست" ٹھیک ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ غلط نویس کاتب نے کسی اور لفظ کی جگہ اسے لکھ دیا ہو۔ اس پر ان کی اس رائے کا بھی اضافہ کر لیجیے جو شیفتہ نے گلشن بے خار میں مہر سے متعلق نقل کی ہے کہ "پستش اگرچہ اندک پست است امّا

بلندش بسیار بلند ،، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پسند و ناپسند اور بلند و پست کا معیار کیا رخ اختیار کر رہا ہے۔

(رسالہ تحریر تماہی۔ جلد ۴ ۔ شمارہ نمبر ۴ بابت ۱۹۷۰ء ص ۱۲ تا ۱۶)

(۸) منتہی المقال فی شرح حدیث لا تشد الرحال

یہ کتاب مفتی صدر الدین آزردہ کی مشہور کتاب ہے اور تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ بھی نایاب ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد اس کے اور در المنضود کے متعلق لکھتے ہیں کہ میری نظر سے گزری ہیں۔ (نقش آزاد ص ۳۱۳) لیکن مختار الدین احمد آرزو لکھتے ہیں کہ کسی کتاب خانے کی فہرست میں ان کے مکمل متن سے متعلق کوئی اطلاع دیکھنے میں نہیں آئی۔ جویندہ یابندہ۔ حسن اتفاق سے اس کا مکمل متن مجھے دستیاب ہو گیا۔ یہ نادر الوجود نسخہ کتب خانہ محمدیہ جامع مسجد بمبئی میں موجود ہے۔ سائز ۲۳ × ۱۴ پر مطبع علمیہ دہلی میں چھپا ہے۔ سنہ طباعت ۱۲۶۴ھ درج ہے۔ آخر میں مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی سعد اللہ مرادآبادی کی تقریظات بھی شامل ہیں۔ کل ۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

چونکہ یہ بالکل نادر اور نایاب ہے اس لیے اس کا تفصیلی طور پر تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔

وجہ تالیف: حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی کے تلامذہ اور ان سے انتساب رکھنے والوں میں ایک گروہ تو شاہ صاحب کے مسلک پر گامزن تھا اور مسائل دینی میں اس سے سرِ مو انحراف پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر دوسرا گروہ اجتہاد اور عدم تقلید کا رجحان رکھتا تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ان دونوں گروہوں میں مختلف مسئلوں میں اختلاف رونما ہوا۔ نوبت بحث و مناظرہ تک پہنچی۔ دونوں کی جانب سے متعدد کتابیں اور رسالے لکھے گئے۔ انھیں میں ایک مسئلہ "زیارت قبور"

کا بھی، تو اچونکہ اس دور میں علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن حزم کی تصنیفات ہندوستان میں پہنچ چکی تھیں اور اہل علم کا اچھا خاصا گروہ ان کے خیالات سے متاثر ہوا۔ اور مسائل میں ان کی پیروی کرنے لگا۔ اس لیے مفتی صاحب نے ابن تیمیہ کی کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم" اور ابن حزم کی کتاب "المحلی" کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ ان کتابوں میں انبیاء کرام اور اولیاء عظام کی قبروں کی زیارت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

ابن تیمیہ کے معاصرین میں تقی الدین السبکی کی کتاب "شفاء الاسقام فی زیارۃ خیر الانام" اس موضوع پر بڑی اہم کتاب ہے۔ لیکن مفتی صاحب نے بھی اس موضوع پر بعض نادر تحقیقات پیش کی ہیں۔ خصوصاً انھوں نے عربی زبان دانی کے قواعد اور اصول فقہ کی روشنی میں جو نکتے پیدا کیے ہیں ان سے ان کی ذہانت، فقیہانہ بصیرت، اور محدثانہ تبحر علمی کا اظہار ہوتا ہے۔

کتاب کا دیباچہ نہایت فصیح و بلیغ عربی میں تحریر فرمایا ہے۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ "اس زمانے میں علم کے آثار مٹتے جا رہے ہیں۔ بڑی بڑی علمی شخصیتیں اٹھ چکی ہیں۔ اب صحیح معنوں میں علم کی قدر و منزلت باقی نہیں رہی۔ کم ہمتی اور تن آسانی کی بناء پر لوگ تحقیق کی دشوار گزار راہ میں قدم نہیں رکھتے۔ اس لیے ان کے سامنے حق و ثواب کی راہ اوجھل ہو گئی ہے۔ اب علماء انھیں کہا جاتا ہے جنھیں علم سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ حضرات کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے مقتدا اور رہبر بن گئے ہیں اور انھیں راہ راست سے بھٹکا رہے ہیں۔ ان حضرات کی نظر صرف روایتوں کی نقل پر ہے اس کے اندر جو باریکی اور رموز ہیں۔ اس پر انھوں نے کبھی غور و خوض ہی نہیں کیا۔ حالانکہ زبان دانی کے فن سے یہ آشنا ہوتے اور دلائل و اصول کی روشنی میں غور کرتے تو ان پر اصل حقیقت واضح ہو جاتی مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ علمائے حق سے دنیا خالی ہو گئی ہو اس زمانے میں بھی کچھ لوگ ایسے مل جائیں گے۔ جن کے سامنے مسائل کی باریکیاں آشکارا ہیں۔

ان میں سے جن لوگوں نے قول مرجوح کو اختیار کیا ہے اس کو انھوں نے اپنے فہم کے مطابق بڑی نادر تحقیق سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ ان کی سر اسر خام خیالی ہے۔ یہ چونکہ ہر نئی چیز کے شیدائی ہیں اس لیے انھوں نے اپنی جدت پسندی کی بنا پر اپنا مقتدا اور سرخیل ابن تیمیہ اور ابن حزم کو قرار دیا۔ اور ان کے تمام تر خیالات کا ماخذ انھیں دونوں کی کتابیں ہیں۔ لیکن ان کی گمراہی کے لیے یہی بات کافی ہے کہ انھوں نے انبیاء اور اولیاء کی قبروں کی زیارت کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ حضرات اس کی دلیل میں حدیث "لا تشد الرحال الخ" کو پیش کرتے ہیں۔ میں نے اسی لیے اس حدیث کی تشریح پر توجہ کی تاکہ لوگوں کو پریشان خیالی سے نجات ملے اور نفس مسئلہ کی صحیح صورت ان کے سامنے آجائے۔"

مقدمہ کتاب: چنانچہ اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

الحمد للہ الذی جعل البیت آمناً ومثابۃً للناس اجمعین وجعلہ ھدیً ومبارکاً للعالمین وفضل المدینۃ علی سائر البلاد وشرفہا بحلول خیر العباد وجمع لہا بین طریف الفضل والتلید وھی تنفی الناس کما ینفی الکیر خبث الحدید۔ فیہا روضۃ من ریاض الجنۃ والنزول فیہا من الماثم جنۃ و شرف بیت القدس وبارک حولہ واشہر بین الناس مجدہ وطولہ وجعلہ مہبط الوحی ومتعبد الانبیاء ومستقر عبادۃ المکرمین والصلحاء وفضّل المساجد الثلثۃ علی مساجد العالم وعظمہا وکرّم فضائلہا فجعل ان تحدّ بحدّ او تحدّ بعد او تحصر بکلام او تحصیٰ بنظام تشدّ الرحال الیہا من کلّ بلدۃٍ وقریۃ وفلاۃ والصلوٰۃ فیہا بمائۃ الف او خمسمائۃ صلوٰۃ والصلوٰۃ

علیٰ سیدنا محمدن الذی ھوافضل من کلِّ راکعٍ وساجدٍ و علیٰ آلہ واصحابہ الطاھرین الغترالاماجد ماذکر المسجود لہ فی المساجد ورضوان اللہ علی المقتفین بآثارھم الذین بذلوا جھدھم فی استنباط الاحکام و تحقیق عقائد الاسلام وقبلوا علی تمھید اصولھا و قوانینھا وتلخیص حُججھا و براھینھا و اَبرَمُوا قواعد الدین ومنھدوھا دروقعوامبانیھا وشیدوھا وارشدوا المسترشدین بایضاح المحجۃ والزموا المعاندین باقامۃ الحُجۃ و حفظوا قواعد الشریعۃ الحنفیۃ السمحۃ البیضاء من ان تزُلزلھا شُبَہُ اھل البدع والاھواء شکر اللہ سعیھم واعادالینا نفعھم۔

امابعد۔ فیقول العبد المسکین محمد صدرالدین وفقہ اللہ للعمل فی یومہ لغدہٖ قبل ان یخرج الامرمن یدہٖ انّ العلم فی ھذ الزمان قد اندرس آثارہ وسقط عن القلوب محلہ و مقدارہٗ ولقبت انھارہ وقلحت اشجارہٗ غربتْ شموسہٗ واقمارہٗ و ولت اصحابہ والصارہ توافلت ثوابتہٗ وسیارہٗ ورحلت احبارہ واخیارہ حتی صار الیوم عیباً فاضحاً ونقصاً واضحاً فاضحی العلم مغلوباً والجہل مطلوباً والنقص کمالاً والحمق جمالاً والکمالُ وبالاً والحکمۃ ضلالاً والعقل فضولاً والجہل مقبولاً والبدعۃ سُنۃً والضلالۃ حکمۃً و انصرفت الھمم عن تحصیل الحق بالتحقیق وزلّت الاقوام عن سواء الطریق بحیث لایوجد راغبٌ فی العلم ولاخاطبٌ للفضیلۃ وصارت الطباع کانھا مجبولۃٌ علی الجہل والرزیلۃ ومابقی من العلم الّا الاسم ولا من الدین الا الرسم واما الذین لقبوھم الجہلۃ بالعلماء فاکثرھم کما تری اما علی قلوبھم اکنۃٌ فلا یکادون یفقھون حدیثاً

او یحسدون الناس علی ما اتٰھم اللّٰہ من فضلہ فاذا جاءھم ما
عرفوا من الحق کفروا بہ وارادوا تلبیساً وتزلیساً وطائفۃ منھم یفنیون
الاعمال ولا یستضیئون بالانوار ویحسبون انھم یحسنون
صنعا ومنتھی ما یرتفع الیہ نظرھم ھو النقل عن الکافی والکفایۃ من
غیر التفات الی درایۃ واستبصار فی روایۃ والقواشر اشرھم علی
تصفح الروایات من الفتاوی الغیر المعتمدۃ او النقل عن شخص معین
او مجھول من غیر ان یخطر ببالھم تحصیل فن الادلۃ والاصول
الم یعلموا ان الذاھل عنہ کبان علی غیر اساس واذا سئل عما
ھو علیہ لم یقدر علی ایراد حجۃ وقیاس فیاحسرۃ علی ابناء الزمان
انھم قد اتخذوا الظھریاً وصار الطلبہ عند ھؤلاء شیئاً فریا
والمختار عند جماعۃ منھم الاخذ بالقول المرجوح الذی لا یغنی
من جوع ولا ینفع لوح ومنھم من یتمسک بروایۃ فقھیۃ
نادرۃ فذلک زعماً منھم ان لکل جدید لذۃ کل بضاعتھم الطعن
فی الائمۃ المجتھدین وجل متاعتھم القدح فی الاولیاء المقربین
الصراط المستقیم والمحلی ماخذھم واساسھم وابن تیمیۃ وابن
حزم رئیسھم وراسھم لا یھتدون الی طریق الحق بل یترددون فی
تیہ بلا ھاد ولا دلیل وھم اضلوا کثیراً وضلوا عن سواء السبیل
وفئۃ منھم یقلدون آباءھم فھم علی آثارھم مقتدون اولو کان
آباؤھم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون وبعضھم یستنبطون الاحکام
عن الاحادیث والقرآن لا یعلمون شیئاً من العلوم حتی علم اللسان
وھم اذا وقعوا فی معضلۃ عمیاء خبطوا فیھا خبط عشواء والذین
معھم متجانبون عن الاتباع والتقلید ویقولون ان ھذا لیس بسواء
السبیل واذا رجعوا الی شھداءھم یقبلون قولھم بلا حجۃ ولا دلیل

ولقد منّ اللہ سبحانہ علیٰ هذہ الامۃ بوجود العلماء فی کل عصر الذین عضوا فی العلم بنواجذهم ورموا عرض الامابۃ بنوافذهم وصرفوا فی تحصیل العلم اعمارهم واخیوا لکسب الفضائل لیلهم ونهارهم فالفوا وافادوا وصنفوا واجادوا۔ فطوبیٰ لمن راجع الیهم ونزل ربا عهم واریٰ الحق حقاً ورزق اتباعه و سحقاً للقوم الذین لایتردون الیهم ولا یرجعون اماتلیت علیهم قل هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون وکفی بنا مستنوا علیٰ غوایتہ کبرائهم انّهم حرموا السفر الی زیارۃ قبور الانبیاء والاولیاء متمسکین بحدیث لا تشد الرحال۔ فاملیتُ علیهم فی شرحه ماینجیهم عن الضلال مع تفرق البال وتشتت الحال، فظلت اعناقهم خاضعین وقالوا آمنّا بماجاءنا من الحق المبین واللہ سبحانہ هو المسئول ان یوفقنا للصدق والصواب یصون عقولنا عن الزیغ والارتیاب ویجعلنا ممّن شرح بالحق صدرہ اوشرح فی فتح باب الاشکال فرفع قدرہ وهو علیٰ مایشاء قدیر وبالاجابۃ جدیر۔"

اصل موضوع اور خلاصہ بحث :۔ بخاری اور مسلم میں ایک حدیث ہے

لاتشد الرحال الا الیٰ ثلاثۃ مساجد المسجد الحرام ومسجدی هذا والمسجد الاقصیٰ

یعنی مسجد حرام مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے سوا سفر کا اہتمام نہ کیا جائے۔

علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن حزم اس حدیث کی بنیاد پر تمام انبیاء اور اولیا کے قبروں کی زیارت کے لیے عزم سفر کو حرام قرار دیتے ہیں اور عمومی نہی سے مرقد نبوی کو بھی مستثنیٰ نہیں کرتے۔

بظاہر اس حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان تین مسجدوں کے لیے تقربی سفر کا ارادہ کرنا تو مستحب ہے اور ان تین کے سوا کہیں اور کے لیے قصد کرنا بالکلیہ

ممنوع ہے۔

مفتی صاحب نے اپنی اس کتاب میں مندرجہ حدیث کے صحیح مفہوم کو اصول اور دلائل کی روشنی میں متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ دراصل علم اللسان کے قواعد اور اصول فقہ سے ناواقفیت کی بنا پر اس حدیث سے غلط نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔

پہلے انھوں نے خاص طور سے اس نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس کا تعلق نماز کی فضیلت سے ہے چونکہ ان تینوں مسجدوں میں نماز پڑھنا زیادہ افضل اور باعث ثواب ہے۔ اسی لحاظ سے "لاتشد" کے الفاظ میں بطور خبر کے یہ بات کہی گئی ہے۔ اور یہ جملہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ لین دین کی دستاویز لکھنے کے سلسلے میں قرآن میں "ولا یضار کاتب ولا شہید" فرمایا گیا ہے (لکھنے والا اور گواہ نقصان دہ کرے) یعنی مدعی اور مدعا علیہ میں سے کسی کا بھی نقصان نہ کرے۔ اس قسم کے جملوں میں حکم یا نہی جو ہوتی ہے وہ صریحی حکم و نہی کے مقابلے میں زیادہ بلیغ ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ شارع کا مقصد بھی اس حدیث میں اسی قسم کا ہے۔ یہ کلام اگرچہ نفی کی صورت میں ہے۔ مگر اس سے مقصود یہ ہے کہ فضیلت صلوٰۃ کے لیے ان مسجدوں کے سوا دوسری جگہوں کا سفر نہ کیا جائے۔ کیوں کہ گوناگوں لحاظ سے ان تینوں مسجدوں کو دوسری مسجدوں پر فضیلت حاصل ہے اسی لیے اسی اعتبار سے دوسری مسجدوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اگر یہ اہمیت نہ ہوتی تو لا السیافر بھی کہا جا سکتا تھا۔

علمائے اصول نے جہاں مستثنیٰ کے مبحث پر اظہار خیال کیا ہے وہاں انھوں نے اس کی ایک قسم مستثنیٰ مفرغ بھی بتائی ہے۔ مستثنیٰ مفرغ کا جہاں استعمال ہوتا ہے۔ اس جگہ عام طور سے مستثنیٰ منہ محذوف ہی ہوا کرتا ہے۔ اور اس کا تعلق اسی کی جنس سے ہوتا ہے اور قرائن اور قیاس سے سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت سی مثالیں نقل کی ہیں، اور یہ بھی بتایا ہے کہ جملہ محققان شافعیہ حدیث لاتشد الرحال میں "لفظ مساجد" ہی کو محذوف مانتے ہیں۔

پھر صحیح بخاری میں جہاں یہ حدیث درج ہے اس کے بعد ہی جو دوسری حدیث ہے اس میں مکہ و مدینہ کی مسجد میں نماز کی فضیلت کا بیان ہے چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

صلوٰۃ فی مسجدی ھذا خیر من الف صلوٰۃ فیما سواہ

یعنی میری اس مسجد میں نماز پڑھنا اس کے سوا تمام مسجدوں کی نماز سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

اسی کی تائید حدیث میمونہؓ سے جو مسلم و نسائی میں ہے اور حدیث عبداللہ بن زبیرؓ سے بھی ہوتی ہے جو بزاز و طبرانی اور ابن حبان نے اپنی مسندوں میں نقل کی ہے، ان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی خواہ کسی مسجد میں نماز ادا کی جائے چاہے اسے کسی نبی سے نسبت حاصل ہو یا ولی سے تو اجر و ثواب کے لحاظ سے ان کا وہ درجہ نہیں ہے جو ان تینوں مسجدوں میں پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔

حدیث لاتشد الرحال کا جو مفہوم ان حضرات نے سمجھا ہے اس کی بنا پر تو کسی ضرورت اور غرض کے لیے سفر کیا ہی نہیں جا سکتا۔ حالانکہ حدیثوں میں تعلیم و تعلم کے لیے سفر کرنے کی تاکید ملتی ہے۔ جہاد کے لیے رخت سفر باندھنے کا ذکر بار بار آتا ہے۔ تاریخی مقامات اور قدرتی آثار و نشانات کے مشاہدہ کے لیے قرآن پاک میں سفر کی ترغیبات موجود ہیں۔ خدمت والدین۔ دوستوں کی ملاقات و عیادت کے سلسلے میں جس قدر حدیثیں بیان کی گئیں ان سے مقصد محدثین کا ان کا استحباب اور وجوب ہی ہے۔ تجارت اور کاروبار کے لیے سفر کو بالاتفاق سب نے جائز قرار دیا ہے۔ تو جس طرح ان تمام اغراض کے لیے عزم سفر جائز اور مباح ہے اور ان میں سے کوئی بھی حدیث لاتشد الرحال کے دائرہ میں نہیں آتا تو پھر کسی نبی اور ولی کے مزار کی زیارت کو کیوں ممنوع قرار دیا جائے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ حدیث لاتشد الرحال میں جو نہی یا ممانعت ہے وہ محض طاعت و عبادت اور فضیلت نماز کے نقطہ نظر سے ہے۔ اس کا اطلاق

دوسری اغراض کے سفر پر کرنا صریحی زیادتی ہے۔ اس حدیث کی توضیح و تشریح کے سلسلے میں فقہائے حنفیہ و شافعیہ نے جو رائیں پیش کی ہیں ان کے مطالعہ سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔

شارحین حدیث میں سے علامہ عینی نے شرح بخاری میں طحاوی نے مشکل الآثار میں۔ علامہ ابن حجر نے فتح الباری شرح بخاری میں مولانا نور الحق محدث دہلوی نے تیسیر القاری میں۔ ملا علی قاری نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں محدث جمال الدین اور ان کے صاحبزادے میرک شاہ اور علامہ طیبی نے شرح مشکوٰۃ میں نووی نے شرح مسلم میں مناوی نے شرح جامع الصغیر میں۔ شیخ عبد اللطیف نے مبارق الازہار شرح مشارق الانوار میں حدیث لا تشد الرحال کی شرح میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی اسی موقف کی تائید ہوتی ہے۔ سب نے یہی خیال ظاہر فرمایا ہے کہ ان تینوں مسجدوں میں نماز کی اہمیت و فضیلت کے اعتبار سے یہ بات کہی گئی ہے۔

چنانچہ اسی بنا پر یہ مسئلہ بھی پیدا ہوا کہ اگر کوئی شخص ان تینوں مسجدوں میں نماز پڑھنے کی نذر مانے تو اس کی نذر کیا کسی مسجد میں بھی نماز ادا کرنے سے پوری ہو جائے گی؟ تو فقہاء و محدثین کا یہی فیصلہ ہے کہ اس کی نذر اس وقت تک پوری نہیں ہوسکتی جب تک کہ ان تینوں میں سے کسی ایک میں وہ نماز نہ ادا کرے۔ بخلاف اس کے دوسری مسجدوں میں نماز پڑھنے کی نذر مانے تو کسی مسجد میں بھی نماز ادا کرنے سے نذر پوری ہو جائے گی۔

اسی بنا پر علمائے محدثین میں سے محی السنۃ ابن الفراء البغوی۔ علامہ تورپشتی علامہ ابن الیر۔ علامہ محمود بن حملہ وغیرہ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر ان تین مسجدوں میں سے کسی میں نماز کی نذر کی جائے تو اس کے لیے شدّ رحال ضروری ہے۔

امام غزالی اسی بنا پر فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے علماء و صلحاء کی قبروں کی زیارت سے محض اس حدیث کی بنا پر ممانعت کی ہے ان کا موقف واضح

نہیں ہے، جبکہ دوسری حدیثوں میں زیارت قبور کا صریحی طور سے حکم موجود ہے۔ ان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کی نوعیت سفر الگ الگ ہے۔ اور اسی لیے زیارت قبور کے لیے صیغہ امر استعمال کیا گیا ہے۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ "حضرت ابوہریرہؓ" نے بصرہ بن ابی بصرہ سے ملاقات کی تو انھوں نے پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کوہ طور سے۔ اس پر بصرہ نے کہا کہ اگر آپ جانے سے پہلے مجھے ملے ہوتے تو میں آپ کو وہاں نہ جانے دیتا کیوں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ان تینوں مسجدوں کے سوا کسی دوسری جگہ کا سفر نہیں کرنا چاہیے۔" یہ حدیث موطا امام مالک میں ہے۔ اور اسے مانعین زیارت اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں لیکن مفتی صاحب کہتے ہیں کہ یہ حدیث بھی ہماری ہی تائید میں ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں جو پہلو مخفی رہ گیا ہے دوسری حدیثوں سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے چنانچہ یہی واقعہ احمد و بزاز کی مسند اور طبرانی کی الکبیر اور الاوسط میں جہاں نقل کیا گیا ہے وہاں صاف اس کی تصریح موجود ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کوہ طور پر نماز ہی پڑھنے کی غرض سے گئے تھے۔ انھوں نے یہی سمجھا تھا کہ یہ مقام تجلیات الہیٰ کا مہبط اور مرکز رہ چکا ہے۔ اور حضرت موسیٰؑ سے اللہ تعالیٰ نے گفتگو فرمائی تھی اس لیے نماز کے ثواب میں زیادتی ہوگی۔ اور بصرہ نے اسی بنا پر انھیں روکا۔ حالاں کہ طور مسجد نہیں ہے۔ مگر طور پر جانے کی غرض طاعت و عبادت الہیٰ ہے۔ اس لیے اصل حکم پر قیاس کر کے یہ بات کہی گئی۔ اور چوں کہ حکم کی علت طاعت و عبادت ہی ہے اس لیے حضرت بصرہ کا کہنا بجا تھا۔

پس یہ علت جہاں بھی پائی جائے گی خواہ وہ طور ہو یا کسی نبی اور ولی کا مزار اس پر یہی حکم مترتب ہوگا غالباً یہی وجہ ہے کہ افضل المحدثین حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ اور موطا کی شرح مصفا و مسوی میں اس قسم کے مقامات پر جانے سے روکتے ہیں۔ شاہ صاحب نے بھی زیارت

اس حدیث سے قیاس مستنبط کی بنا پر کہی ہے۔ کیونکہ حکم کی علت اصل اور فرع میں مشترک ہوا کرتی ہے اور چونکہ شدِّ رحال والی حدیث میں علت طاعت وعبادت الٰہی ہے اور زیارت قبور میں یہ علت پائی نہیں جاتی اس لیے زیارت قبور کی ممانعت کبھی نہیں ہو سکتی۔ زیارت قبور میں صرف دعا واستغفار ہوا کرتا ہے اور زیارت قبور کا طریقہ ہمارے نزدیک وہی صحیح ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہو۔ یعنی اموات کے لیے دعائے خیر کی جائے۔ ان کے لیے مغفرت طلب کی جائے۔ تلاوت قرآن اور دعاؤں کے ذریعہ انھیں ایصال ثواب کیا جائے۔ ان کے علاوہ زیارت قبور کے سلسلے میں خلاف شریعت امور کا کوئی اور ارتکاب کرتا ہے۔ ان سے وسیلہ وبرکت طلب کرتا ہے۔ مرادیں مانگتا ہے تو اس قسم کے افعال قابل مذمت ہیں۔ چاہے وہ سفر کے لیے جائیں یا بغیر سفر کے۔ عوام اور جہلا کے طرز عمل کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اس کی وجہ سے مسئلہ کی نوعیت نہیں ختم ہو جائے گی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ زیارت قبور فعل مستحب ہے۔ صحیح مسلم میں بریدہؓ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

نُهِيتُكم عن زيارة القبور فزوروها (مسلم)
میں نے تمھیں زیارت قبور سے روکا مگر اب تم اس کی زیارت کیا کرو۔

اسی مفہوم کی حدیث حضرت علی سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابو مسعودؓ کی روایت میں اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا کہ

فانها تزهد فی الدنیا وتذکر الآخرة (ابن ماجہ)
اس سے دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی یاد ہوتی ہے۔

ان حدیثوں میں مطلق حکم ہے اس کے ساتھ کسی قسم کی قید نہیں لگائی گئی ہے۔ سفر میں ہو یا حضر میں۔ شہر میں ہو یا اس سے باہر زیارت کی عام اجازت دی گئی ہے۔

ہاں کچھ معاملات زیارت قبور میں خواص اور صوفیائے کرام سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ حضرات اپنی روحانی صلاحیت اور باطنی قوت کی بنا پر بزرگان دین کے مزارات پر کچھ ایسے احوال کا مشاہدہ کرتے ہیں جو دوسرے لوگوں کو نظر نہیں آتے۔ مراقبہ اور روحانی توجہ سے اہل قبور کے ارواح سے انھیں فیض باطنی بھی حاصل ہوتا ہے۔ روحوں کا اپنے بدنی مرکزوں سے کیا علاقہ ہوتا ہے اس پر متکلمین اسلام نے بھی اظہار خیال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح انسان سفر میں چلا جائے تو اس کی یاد سفر میں آتی رہتی ہے اسی طرح موت کے بعد بھی روحوں کا بدنی مرکزوں سے تعلق باقی رہتا ہے۔ امام رازی تو کہتے ہیں کہ زیارت کرنے والا اگر صاحب قبر سے روحانی وابستگی رکھتا ہے تو اس سے مستفیض بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح علامہ تفتازانی بھی زیارت قبور سے روحانی نفع کے قائل ہیں۔ بہر حال روح اور قبر کے علاقہ پر عقلی طور پر بہت کچھ گفتگو کی گئی ہے

زیارت قبور کے کچھ شرائط اور آداب ہیں جو معتبر کتابوں میں بتلا دیے گئے ہیں۔

اب رہا سرور کائنات اور افضل الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقد مطہر کی زیارت۔ تو اس کی اہمیت میں کوئی کلام ہی نہیں کیا جا سکتا۔ روحانی ارتقا کے لیے اس مقام کو جو بلندی اور رفعت حاصل ہے۔ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شیخ احمد قسطلانی رسول اکرمؐ کی قبر مبارک کی زیارت سے روکنے والے کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ قاضی عیاضؒ اپنی کتاب "شفا" میں اس کے لیے شد رحال کو واجب کہتے ہیں۔ بہت سے علما اسے مستحب، بہت سے مستحب موکد۔ اور بہت سے واجب قرار دیتے ہیں۔ اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قریب قریب اس کی اہمیت واجب کے درجے تک ہے کیوں کہ زیارت قبر نبوی کے سلسلے میں جو احادیث آئی ہیں۔ ان سے تو حد درجہ تاکید پائی جاتی ہے

اس سلسلے میں فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتح القدیر۔ مناسک الفاسی، شرح المختار، درالمختار طحطاوی، مناسک الطرابلسی کے حوالے دیے گئے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقد مطہر کی زیارت، باعث خیر و برکت اور قیامت کے روز آپ کی شفاعت اور مقام محمود کے حصول کا ذریعہ ہے جب مسلمان فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے جائے تو اس سعادت سے بھی اسے مشرف ہونا چاہیے۔

حضرت ابن عباس کی روایت ہے۔ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

من حج فزار قبری بعد موتی کان کمن زارنی فی حیاتی۔ | جس نے حج کیا اور پھر میری موت کے بعد میری قبر کی زیارت کی تو اس نے گویا میری حیات میں مجھ سے ملاقات کی

اسی طرح حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔

من زار قبری فقد وجبت لہ شفاعتی۔ | جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت ضروری ہو گئی۔

انس بن مالک کی روایت ہے کہ حضورؐ فرماتے ہیں کہ۔

من زارنی بالمدینۃ محتسباً کنت لہ شفیعاً وشاہداً یوم القیامۃ | جس نے پوری احتیاط کے ساتھ مدینہ کے اندر میری زیارت کی تو اس کے لیے میں قیامت کے روز شفیع اور گواہ رہوں گا۔

دار قطنی کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ

من جاءنی زائراً لا یعملہ حاجۃ الا زیارتی کان حقا | جو میرے پاس بغیر کسی ضرورت کے محض زیارت کی غرض سے آیا تو میرے

علی ان اکون لہ شفیعا یوم القیٰمۃ — اور پر حق ہے کہ میں اس کے لیے قیامت کے روز شفاعت کروں۔

یہ اور اس مضمون کی اور بہت سی حدیثیں اس باب میں آئی ہیں جو حدیث کی معتبر کتابوں میں درج ہیں اور محدثانہ نقطہ نظر سے بالکل صحیح اور معیاری ہیں انھیں پڑھ کر مرقد نبوی کی زیارت کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ صحابہ کرام کا معمول تھا کہ جب وہ مزار مبارک کے قریب سے گزرتے تو آپ کی بارگاہ میں درود و سلام پیش کرتے۔ سفر کے ارادے سے باہر جاتے یا واپس آتے تو آستانہ نبوی میں حاضری دے لیا کرتے تھے۔"

اقتباس متن :- اردو داں حضرات کی واقفیت کے لیے کتاب "منتہی المقال" کی تلخیص پیش کر دی گئی۔ جو لوگ اردو کے علاوہ عربی اور فارسی سے بھی آشنا ہیں اور زیارت قبور کے مسئلے سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کی مزید معلومات کے لیے کتاب کے اہم حصے کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"بخاری در باب فضل الصلوٰۃ فی مسجد مکہ والمدینۃ از ابوہریرہؓ روایت کرد کہ فرمود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد المسجد الحرام ومسجد الرسول والمسجد الاقصیٰ و در باب مسجد بیت المقدس روایت کرد ایں حدیث را از ابو سعید خدریؓ از پیغمبر خدا صلعم قال لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد مسجد الحرام ومسجد الاقصیٰ ومسجدی۔ وہمچناں روایت کرد مسلم ایں حدیث را در صحیح خود از ابوہریرہؓ وفی المشکوٰۃ عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد مسجد الحرام ومسجد اقصیٰ ومسجدی ہذا متفق علیہ۔ انتہیٰ۔

دریں حدیث بیان فضل صلوٰۃ ست دریں مساجد ثلاثہ از جہت اختصاص
ایں مساجد بمزایا و فضائل و مزیّت اینہا بر غیر اینہا از مساجد۔ ولا تشدّ اخبار ست
در معنی نہی۔ لقولہ تعالےٰ ولا تضار کاتب ولا شہید۔ وچنانکہ بگوئی تذہب الی
فلان تقول لہ کذا بمعنی اذہب الی فلان۔ وقل لہ کذا و ایں ابلغ است از نہی صریح
قال المفسرون لما فیہ من ایہام ان النہی سارع الی الانتہاء و ہو یخبر عنہ و اہل اصول
گفتہ اند کہ خبر شارع آکد است از امر او و نہی او پس ایں کلام بحسب صورت نفی
ست و معنی نہی۔ ای لا تشدّوا الرحال الی غیرہا من المساجد و نادر ایں اخبار بلا
تشد الرحال دون لا یسافر۔ از برای آن ست کہ بغیر بنفی شد رحل بسبب اشتمال
آن بر تصویر حال مسافرت از سر انجام دادن اسباب و سامان آن و مہیا کردن
آلات و ادوات آن از تہیۂ مطایا و مراکب و فراہم آوردن ساز و برگ سفر و بستن
پالان بر شتر۔ ابلغ است از تعبیر بلفظ لا یسافر کہ ایں لطافت را مشتمل نیست
و بجہت خروج نہی بمخرج اخبار تقدیر کلام چنیں باشد لا ینبغی و لا یستقیم ان تشدّ
الرحال و یسافر الی مسجد من المساجد بقصد ادراک فضیلۃ الصلوٰۃ فیہ الا الی ہذہ
المساجد الثلٰثۃ۔ و مساجد را کہ مستثنیٰ منہ ایں کلام مقدر کردیم بچند وجوہ است
وجہ اول۔ آنکہ ایں استثنا مفرّغ است و استثنائے مفرغ را مقدر عام
کہ مستثنیٰ منہ آں لو باشد بکار ست تا متناول باشد مستثنیٰ و غیر آنرا و گرنہ اخراج
صورت نہ بندد۔ و ضرور است مناسبتی میانہ مستثنیٰ منہ مقدر و مستثنیٰ من حیث
الجنس و الوصف و از مناسبت در جنس بودن مستثنیٰ منہ بجنیتی کہ اطلاق آں
بر مستثنیٰ صحیح باشد مراد نداشتہ اند بلکہ مراد اخص از معنی مذکور است۔ مثلاً در نحو ما ضرب الا زید
احدا را تقدیر کنند و گویند ما ضرب الا زید لا شئ و لا جسم و لا حیوان۔ و در نحو ما کسوتہ
الا جبۃ لباساً۔ و در نحو ما جاء الا راکباً کائناً علی حال من الاحوال و در نحو ما سرت
الا یوم الجمعۃ وقتاً من الاوقات و در نحو ما صلیت الا فی المسجد فی مکان و در
نحو ما صلیت الا فی المسجد الجامع فی مسجد من المساجد را مقدر نمایند۔ و مراد از

مناسبت در وصف مناسبت او با مستثنیٰ در وصف فاعلیت یا مفعولیت یا یا ظرفیت یا آلیت وغیر آن ست. الحاصل در استثنائی مفرغ ہمچو مستثنیٰ منہ عام کہ اقرب باشد الی المستثنیٰ تقدیر کنند ونیز رعایت اقتضائی مقام را در تقدیر عام از واجبات شمارند و در نحن فیہ قید قصد صلوٰۃ ماخوذ ست باتفاق علمائی اہل حدیث یعنی لاتشد الرحال لقصد الصلوٰۃ الی ثلثۃ مساجد. پس مستثنیٰ منہ آن حسب اقتضائی مقام موضعی خواہد بود کہ موضوع ست العبادۃ اللہ وما ہو الا المسجد لان المسجد عبارۃ عما یعبد اللہ فیہ. این ست تحقیق علمائے اصول قال فی مسلم الثبوت. فالاوجہ ان مبناہ اعتبار نوع المستثنیٰ المفرغ او جنسہ فقدر الحنفیۃ الاول والشافعیۃ الثانی والراجح الاول لان المتبادر من ما فی الدار الا زید انہ لیس فیہا انسان الا زید لا حیوان. انتہی۔

وفی شرحہ لمولانا المولوی عبد العلیؒ مع ھذا موافق لما فی التحریر لابن ہمام ماخوذ من کلام الحبر الہمام فخر الاسلام البزدوی فی مبحث القیاس وعلی ھذا قال الامام محمدؒ فی قولہ ان کان فی الدار الا زید فعبدی حر ان المستثنیٰ منہ بنو آدم ولو قال الا حمار کان المستثنیٰ منہ الحیوان ولو قال الا ثوب کان المستثنیٰ منہ کل شیٔ فعلم ان المستثنیٰ منہ ما یکون اقرب الی المستثنیٰ ولعل ھذا ظاہر لمن لہ ادنی استقرأ وتدبر فی الکلام. انتہیٰ۔

قال فخر الاسلام البزدویؒ فی باب شروط القیاس ان المستثنیٰ منہ انما یثبت علی وفق المستثنیٰ فی ما استثنیٰ من النفی کما قال فی الجامع ان کان فی الدار الا زید فعبدی حر ان المستثنیٰ منہ بنو آدم ولو قال الا حمار کان المستثنیٰ منہ الحیوان ای الحیوان الذی یقصد بالسکنیٰ ولو قال الا متاع کان المستثنیٰ منہ کل شیٔ انتہیٰ۔

وفی التحقیق شرح الحسامی. المستثنیٰ منہ فی النفی اذا لم یکن

مذکور شیت وبقدر علی وفق المستثنیٰ تحقیقاً للاستثنا. فانہ لایصح الا فی الجنس من حیث الحقیقۃ حتی لو قال ان کان فی الدار الا زید فعبدی حر کان المستثنیٰ منہ بنی آدم کانہٗ قال ان کان فی الدار احد من بنی آدم کانّہٗ قال ان کان فی الدار احد من بنی آدم فعندا فلا یحنث بوجود الدابۃ والمتاع فیہا ولو قال الا حمار کان المستثنیٰ منہ الحیوان الذی یقصد بالسکنی حتی لو کان فیہا متاع لا یحنث ولو قال الا ثواب کان المستثنیٰ منہ کل شئ یقصد بالسکنی والامساک فی الدور حتی لو کان فیہا انسان او دابۃ او شئ سوی الثوب مما یقصد بالامساک فی الدور یحنث. انتہیٰ

مخفی نباشد کہ ظاہرا صاحب مسلّم از نوع و جنس درینجا نوع و جنس مصطلح میزانیین گرفتہ کہ اختلاف حنفیہ و شافعیہ در تقدیر مستثنیٰ منہ نقل کردہ۔ حالانکہ در کتب اصول معتبرہ حنفیہ و شافعیہ مراد از جنس مستثنیٰ مفرغ جنس مصطلح میزانیین نیست بلکہ مراد ایشاں از جنس مصطلح اہل اصول است کہ آں نوع است نزد منطقیین فی العضدی وحاشیہ للمحقق التفتازانی فی بحث القیاس۔

انّ اصطلاح الاصولیین فی الجنس یخالف اصطلاح المنطقیین فالمندرج کالانسان جنس والمندرج فیہ کالحیوان نوع وعند المنطقیین فالمندرج کالانسان جنس. والمندرج فیہ کالحیوان نوع وعند المنطقیین بالعکس ومن ھٰھنا یقال الاتفاق فی الحقیقۃ تجانس والاختلاف فیہا تنوع. انتہیٰ۔

والی ھذا اشار فی جامع الرموز فی کتاب البیع حیث قال الجنس اخص من النوع عند الاصولیۃ انتہیٰ۔

مگر چوں در بعضی از کتب حنفیہ از جنس مستثنیٰ مفرغ تعبیر بہ نوع مصطلح اہل

منطق کرده اند تا ناظرین چناں فہمیدند کہ حنفیہ نوع مستثنیٰ مفرّغ و شافعیہ جنس آنرا تقدیر کنند حالانکہ فریقین دریں باب اختلاف ندارند۔ فی المتفق والمختلف للحمیدی لو حلف ان لا یضرب الا زیدا فضرب انسانا غیر زید یحنث ولو ضرب حیوانا لا یحنث عند ابی حنیفة والشافعی رحمہما اللہ۔ وتصریح جملہ محققان علمائے شافعیہ۔ در حدیث لا تشد الرحال مستثنیٰ منہ آں لفظ مساجد مقدّر کردہ اند چناں کہ می آید مفصلاً۔ مؤید ایں تحقیق است و بالجملہ مستثنیٰ منہ در استثنای مفرّغ ضرور ست کہ اقرب باشد الی المستثنیٰ ورنہ باشد ابعید غیر منداول در عرف و ازیں جاست کہ علمای حنفیہ دریں قول صلعم لا تبیعوا الطعام بالطعام الّا سوآءً بسوآءٍ۔ گویند مستثنیٰ منہ ان حال من الاحوال است ای لا تبیعوا الطعام بالطعام فی حال من الاحوال الّا فی حال المساواۃ وحال من الاحوال اگرچہ شامل است حال قلیل را۔ نیز باید نگریست بعد آں از مستثنیٰ مراد نیست و مستثنیٰ منہ آں احوال کثیر ست کہ منحصر ست در مساوات و مفاضلت و مجازفت پس مساوات حلال است و مفاضلت و مجازفت حرام۔ و قلیل دریں حدیث متعرض بہ نیست بر اصل خود کہ اباحت ست باقی ست و ازاں ست کہ بیع الحفنۃ بالحفنۃ وکذا بالحفنتین یعنی بیع مشتی از گندم و امثال ان با مشتی از جنس آں یا دو مشت ازاں جائز داشتند۔

وجہ دوم مطابقت ترجمہ باب صحیح البخاری و مناسبت ایں حدیث با حدیث ما بعد آں۔ فانہما نیا دیان باعلیٰ ندأ علی ذالک۔ ای کون المستثنیٰ منہ المساجد۔ زیرا کہ عقد باب در فضل صلوٰۃ ست بمسجد مکہ و مدینہ۔ پس مقصود در حدیث اول یعنی لا تشد الرحال فضیلت صلوٰۃ است دریں مساجد ثلاثہ نسبت بمساجد دیگر لیکون مطابقاً لترجمۃ الباب والغرض المسوق لہ الحدیث وحدیث ما بعد آں کہ از ابوہریرہؓ مروی ست کہ رسول خدا صلعم فرمودہ صلوٰۃ فی مسجدی ھذا خیر من الف صلوٰۃ فیما سواہ الا المسجد الحرام

نیز مطابق ست برای ترجمہ باب وکاشف ست برای معنی حدیث اول و بلفظ صریح
ست برآنکہ مساجد ثلاثہ را فضل ست بر جملہ مساجد در تضاعف ثواب در ادای
صلوٰۃ زیراکہ مستثنیٰ منہ الا المسجد الحرام باتفاق شراح بخاری مساجد
ست . ای فیما سواہ من المساجد الا المسجد الحرام الا موضوع من المواضع چنانچہ
در حدیث میمونہ رضہ تصریح مستثنیٰ منہ ست بلفظ مساجد - روی المسلم و النسائی
من روایۃ ابن عباسؓ عن میمونۃ قالت سمعت رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم صلوٰۃ فیہ افضل من الف صلوٰۃ فیما سواہ من المساجد
الا مسجد الکعبۃ . و ہمچناں در حدیث عبداللہ بن زبیرؓ رواہ احمدؒ و البزار
و طبرانیؒ و ابن حبانؒ فی صحیحہ من روایۃ عطا بن ابی رباح عن
عبداللہ بن الزبیرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ
فی مسجدی ھذا افضل من الف صلوٰۃ فیما سواہ من المساجد الا
المسجد الحرام . و باید دانست کہ نہی از سفر بطرف مساجد دیگر سوائے مساجد
ثلاثہ باعتبار قصد صلوٰۃ ست و ہمیں مدعا این است کہ شد رحال جانب ہیچیک
مسجدی در عالم و ان کان مسجد القبا و مسجد الخیف ، بقصد صلوٰۃ
سوای مساجد ثلاثہ کہ نص بر آن وارد شدہ ممنوع ست و قیاس دران دخل نیست
پس اگر کدام کس سفر نماید جانب ہیچیک مسجدی سوای این مساجد باین اعتبار کہ
بنای آں مسجد در جوار صلحا است . یا از انبیاء و اولیاء ست و نماز در آنجا افضل
ست از دیگر مساجد . این سفر داخل نہی است . فی العینی شرح البخاری . فان
قلت ما الجمع بین قولہ صلعم لا تشد الرحال و بین کونہ یاتی مسجد
قبا راکبا . قلت لیس ھو مما یشد الیہ الرحال فلا تنافی ولہ الحدیث
المذکور و قول حضرت عمر رضہ کہ اگر این مسجد در قطری از اقطار ارض بودی چہ شتران
کہ در طلب وی ہلاک می شدند . نزد اہل تحقیق از علمای اعلام حنفیہ نصیحت نرسیدہ
و سفری کہ باین قصد و ارادہ نباشد و مقصود از اں مجرد مشاہدہ مسجد بسبب بودنش

انما ابنیه عجیبه و غریبه یا تعلم از عالمی یا زیارت بزرگی که ساکن آن مسجد ست بوده باشد ممنوع نیست وہمچناں شد رحال صرف برائے زیارت قبور اولیاء وصلحاء یا ائی برحال خود ست۔ یعنی مباح نہ حرام نہ مکروہ، وہرگز داخل درین نہی نیست وبا مودی این حدیث نحوی علاقہ ندارد۔

وجہ سوم۔ حدیث حضرت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام خود مفسر ست معنی حدیث لاتشد الرحال کہ وارده شده ست بعض طرق بکمال توضیح مراد وتصریح مقصود وذکر مستثنیٰ منه والاحادیث والآیات۔ تفسیر بعضها بعضاً فی مسند احمد ثنا هاشم ثنا عبد الحمید حدثنی مسهر سمعت ابا سعید الخدری رض وذکر عنده صلوٰة فی الطور فقال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ لا ینبغی للمطی ان یشد رحاله الی مسجد ینبغی فیه الصلوٰة غیر المسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ ومسجدی هذا۔ قال العینی فی شرح البخاری اسناده حسن انتہیٰ

اقول حسن هذا الوجه ظاهر لمن تفحص اقوال العلماء من قدیم وحدیث وای تفسیر احسن من تفسیر الحدیث بالحدیث وهذا هو الحق الذی لا تمتر لشبهة بجدید والصواب الذی لا یرتح الخطا حوالیه۔

وجہ چهارم۔ اقوال جمهور محدثین وشراح بخاری و مسلم وابوداود وشراح مشکوٰۃ واکابر فقہائے حنفیہ وشافعیہ در شرح معنی این حدیث۔ قال العینی فی شرح البخاری۔

هذا باب فی بیان فضل الصلوٰة فی مسجد مکة ومسجد مدینه علی ساکنها افضل الصلوٰة والسلام۔ واما لم یذکر فی الترجمة بیت المقدس وان کان مذکورا معهما لکونه افرده بعد ذلک بترجمة اخری فان قلت لیس فی الحدیث لفظ الصلوٰة۔ قلت المراد

من الرحلة الى المساجد المذكورة فقصد الصلوٰة فيها ثم قال وجهه مطابقة حديث ابي هريرة للترجمة ظاهرة. واما وجهه مطابقة حديث ابي سعيد الخدري اي الحديث الذي قبل هذا الحديث للترجمة فمن حيث انه مشترك لحديث ابي هريرة في الحكم الرابع ولكنه لم يتم متن حديث ابي سعيد اقتصر على قوله وكان غزا مع النبي صلعم وسيذكر تمامه بعد اربعة ابواب في باب مسجد بيت المقدس وتمامه مشتمل على اربعة احكام. والرابع في منع شد الرحال الا الى ثلاثة مساجد انتهى

ثم قال فان قيل فعلى هذا يلزم ان لا يجوز السفر الى مكان غير المستثنى حتى لا يجوز السفر لزيارة ابراهيم الخليل صلوات الله وسلامه عليه ونحوه لان المستثنى منه في المفرغ لابد ان يقدر عاماً واجيب بان المراد بالعام ما يناسب المستثنى نوعاً ووصفاً كما اذا قلت ما رأيت الا زيداً كان تقديره ما رأيت رجلاً واحداً الا زيداً فههنا تقديره لا تشد الرحال الى مسجد الا الى ثلاثة مساجد. انتهى

وفي العيني شرح البخاري قال شيخنا زين الدين من احسن محامل هذا الحديث ان المراد منه حكم المساجد فقط وانه لا تشد الرحال الى مسجد من المساجد غير هذه الثلثه واما قصد غير المساجد من الرحمة في طلب العلم وفي التجارة وفي التنزه وزيارة الصالحين والمشاهد وزيارة الاخوان ونحو ذالك فليس داخلا في النهي وقد ورد ذالك مصرحاً به في بعض طرق الحديث. انتهى

في مشكل الاثار لابي جعفر الطحاوي في باب بيان مشكل ما روي عن رسول الله صلعم في المساجد التي لا تشد الرحال الا اليها ومن فضل الصلوة فيها على غيرها من المساجد وفي تنا ويها في ذالك او في فضل بعضها بعضاً فيه عن ابي سعيد سمعت

النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام یقول لا تشد الرحال إلا الی ثلثۃ مساجد والمسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ ومسجدی هذا ثم قال فعقلنا بذالک ان الرحال لا تشد الا الی هذا المساجد الثلاثۃ دون ما سواها من المساجد فاحتجنا ان نعلم فضل الصلوٰۃ فیها علی الصلوات فی غیرها من المساجد وان نعلم اهذه المساجد الثلاثۃ متساویۃ فی الصلوٰۃ فیها او متفاضلۃ فنظرنا فی ذالک فوجدنا الی اخر ما قال ۔

وفی فتح الباری شرح صحیح البخاری ۔ قولہ الا الی ثلاثۃ مساجد المستثنیٰ منہ محذوف فاما ان یقدر عاما فیصیر لا تشد الرحال الی مکان فی ای امر کان الا الی ثلاثۃ ۔ او اخص من ذالک لا سبیل الی الاول لافضائہ الی سد باب السفر للتجارۃ وصلۃ الرحم وطلب العلم وغیرہ ۔ فتعین الثانی والاولیٰ ان یقدر ما هو اکثر مناسبۃ وهو لا تشد الرحال الی مسجد للصلوٰۃ فیہ الا الی ثلاثۃ مساجد انتہیٰ

وفی تیسیر القاری شرح الفارسی بصحیح البخاری للمحدث الحنفی المولوی نور الحق بن الشیخ عبد الحق المحدث الدهلوی قولہ علیہ السلام لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد ۔ بستہ نشود پالانہا مگر بسوی سہ مسجد یعنی سفر نکنید بقصد دریافت نفس امکنہ ولقعہا کہ آنرا فضیلت ذاتی باشد و نماز کردن دران افضل بود از جای دیگر مگر بسوی این سہ مسجد و باین بیان خارج شد ازین منع رفتن بجای برای کسب علم و زیارت بزرگی زندہ و مردہ و تجارتی و جز آن از انکہ درین صورت رفتن برای دریافت مکان و تبرک بدان نیست بلکہ برای ادراک چیزی کہ دران ست ۔ انتہیٰ

وفی المرقاۃ شرح المشکوٰۃ للملا علی القاری الحنفی ۔ لا تشد الرحال

جمع رحل وهو كعر البعير. والمراد نفی فضیلة شدها در بطها الا الیٰ ثلاثة مساجد. قیل نفی معناه نهی ای لاتشدوا الرحال الیٰ غیرها لان ما سوا المساجد الثلاثة متساوی فی الرتبة غیر متفاوت فی الفضیلة فکان التزحل الیها ضائعاً عبثاً. انتهی

وفی شرح المشکوٰة للسید السند السید جمال الدین المحدث وفی حاشیة نحله السعید زبدة المحققین میرک شاه علی المشکوٰة والطیبی فی شرح المشکوٰة. لا تشد الرحال کنایة عن النهی عن المسافرة الیٰ غیرها من المساجد - انتهی

وفی النووی شرح صحیح المسلم فی هذا الحدیث فضیلة هذه المساجد الثلاثة وفی فضیلة شد الرحال الیها لان معناه عند جمهور العلماء لا فضیلة فی شد الرحال الی مسجد غیرها. انتهی

وفی شرح الجامع الصغیر للمناوی. لاتشد الرحال الا الیٰ ثلاثة مساجد الاستثنا مفرغ والمراد لا یسافر لمسجد للصلوٰة فیه الا لهذه الثلاثة لا انه لا یسافر اصلاً الا لها. والنهی للتنزیه عند الشافعیة کالجمهور. ثم قال وشدها لغیر الثلاثة لنحو علم او زیارة لیس للمکان بل لمن فیه. قال البیضاوی ینبغی ان لا یشتغل الا بما فیه صلاح دنیوی وفلاح اخروی ولما کان ما عدا الثلاثة متساویة الاقدار فی الشرف والفضل وکان الارتحال لاجلها عبثاً ضائعاً نهی الشارع عنه والمقتضی شرفها انها ابنیة الانبیاء ومتعبد انهم انتهی -

وفی مبارق الازهار شرح مشارق الانوار للشیخ عبد اللطیف المعروف بابن الملک. قوله صلعم. لا تشد الرحال الا الیٰ ثلاثة مساجد تقدیره لا تشد الرحال الا مسجد للصلوٰة فیه الا الیٰ ثلاثة

مساجد ومعناہ لا فضیلۃ فی شد الرحال الی مسجد للصلوٰۃ فیہا الا الی ثلاثۃ مساجد والمراد منہ نفی الفضیلۃ التامۃ ومزیۃ ہذہ المساجد لکونہا ابنیۃ الانبیاء علیہم السلام ومساجدہم ولہذا قال الفقہاء لو نذر ان یصلی فی احد ہذہ الثلثۃ تعین بخلاف سائر المساجد فان من نذر ان یصلی فی احدہا لہ ان یصلی فی اخر۔ انتہی۔

ومخفی نباشد کہ احتیاج بدین قیل وقال آنگاہ می افتد کہ معنی ایں حدیث آں باشد کہ اکثر از شراح بخاری ومسلم ومشکوٰۃ تصریح بدان نمودہ اند۔ چنانکہ مذکور شد آنفا۔ واگر معنی حدیث مذکور آن ست کہ جماعت از علمای اعلام محدثین مثل محی السنۃ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی وابن بطال وشیخ علامہ تورپشتی شارح مصابیح وابو عمر بن عبد البر وفاضل علامہ محمود بن جملۃ گفتہ اند کہ اگر کسی نذر کند کہ نماز گذارد در مسجدی سوای ایں مساجد ثلاثہ۔ پس شد رحال نکند بسوی آں مسجد بلکہ در ہر مسجدی کہ نماز گذارد از عہدۂ نذر بر می آید الا این مساجد ثلاثہ کہ اگر نذر گذاردن نماز در یکی ازینہا خواہد کرد تا وقتیکہ نماز دراں نخواہد خواند از عہدۂ نذر نمی تواند بر آمد۔ پس در مستثنیٰ منہ بودن مساجد ہیچ گونہ خفائے والتباسی نیست۔ قال ابن بطال ہذا الحدیث انما ہو عند العلماء فیمن نذر علی نفسہ الصلوٰۃ فی مسجد من سائر المساجد غیر الثلاثۃ المذکورۃ وقال تورپشتی فی شرح المصابیح المراد من الحدیث انہ لو نذر احد ان یمشی الی مسجد للصلوٰۃ لم یجب علیہ المشی الا الی ہذہ المساجد الثلاثۃ۔ لان ہذہ الثلثۃ من ابنیۃ الانبیاء ومتعبداتہم وما سوا ہذہ متساویۃ انتہی۔

قال ابن عبد البر معناہ عند العلماء فیمن نذر علی نفسہ صلوٰۃ فی احد ہذہ المساجد الثلثۃ انہ یلزمہ اتیانہا دون غیرہا۔ انتہی

وقال محمود بن جماعۃ۔ ہذا الذی ذکرہ ہو الحق الذی

لا مجيد عنه ولعل بعض الائمة من الفقهاء والمحدثين يذكرون الحديث في باب النذر والسفر للجهاد وتعلم العلم الواجب وبر الوالدين وزيارة اخوان والتفكر في آثار صنع الله تعالى كله مطلوب للشارع اما وجوباً او استحباباً۔ والسفر للتجارة والاغراض الدنيوية جائز كله خارج عن هذا الحديث فلم يبق الا شد الرحل للمعصية ۔ قال الشيخ ابو اليمن عبد الصمد بن ابي الحسن بن عساكر الدمشقي رحمه الله. قوله لا تشد الرحال معناه اذا نذر الصلوٰة في مسجد غير هذه المساجد الثلاثة لا يلزمه. اى لا ينعقد نذره فيجب ان يشد اليها الرحال ويقطع الى قصدها المسافة بالرحال وبعضى از علما رگفته اند که منع از اعتکاف ست و معنی حدیث این ست که لا يرحل للاعتكاف الى مسجد الا الى هذه الثلاثة اذ قد ذهب بعض السلف الى ان الاعتكاف لا يصح الا فيها دون سائر المساجد كذا في العيني۔

پس انچه از ابو محمد جوينیؒ از شافعیه و قاضی عیاض و قاضی حسینؒ منقول ست از تحریم شد رحال لقصد زیارت جانب قبور صالحین و دیگر مواضع فاضله و تمسک ایشان باین حدیث در صورت صحت نقل خطای فاحش ست. و مخالف قواعد اصول فقه و اهل عربیت و محاوره فصحا است، و مباین ست باغراض مسوق له الحدیث و مورد آن که بطریق دیگر مروی شده و خلاف جمهور و سواد اعظم از محدثین و فقهای حنفیه و شافعیه است و ازینجا ست که حکم کرد قسطلانیؒ در شرح صحیح بخاری بخطای آن و حافظ ابن حجرؒ ببطلان آن۔ و حکم کرد نووی بغلط بودن آن ۔ فی القسطلانی فشد الرحل لزيارة او نحوها كطلب العلم ليس الى المكان بل الى من فيه ۔ وقد التبس ذالك على بعضهم كما قاله المحقق التقي السبكيؒ فزعم ان شد الرحل للزيارة الى غير الثلثة داخل في المنع

وهو خطأ لان الاستثناء کما مر انما یکون من جنس المستثنی منه کما اذا قلت ما رائیت الا زیداً کان تقدیره قلت ما رائیت رجلاً واحداً الا زید الا ما رائیت شیئاً او حیواناً الا زیداً انتہی

فی فتح الباری فیبطل بذالک یعنی من تقدیر المساجد فی المستثنی منه قول من منع شد الرحال الی زیارة قبور الصالحین فی النووی فی باب فضل المساجد الثلاثة ۔ قال الشیخ ابو احمد الجوئی من اصحابنا بحرم شد الرحال الی غیرها وهو غلط وقال فی باب سفر المرأة مع محرم الی الحج وغیره ۔ قال الشیخ ابو محمد الجوئی من اصحابنا ان شد الرحال واعمال المطی الی غیر المساجد الثلاثة کالذهاب الی قبور الصالحین والی المواضع الفاضلة ونحو ذالک حرام وهو الذی اشار القاضی عیاض الی اختیاره ۔ والصحیح عند اصحابنا وهو الذی اختاره امام الحرمین المحققون انه لا یحرم ولا یکره ۔ قالوا والمراد ان الفضیلة التامة انما هی فی شد الرحال الی هذه الثلاثة خاصة ۔ انتہی

قال الامام الغزالی فی احیاء العلوم وقد ذهب بعض العلماء الی الاستدلال بهذا الحدیث فی المنع من الرحلة لزیارة المشاهد وقبور الصلحاء والعلماء وما تبین لی ان الامر لیس کذالک بل الزیارة ماموربها ۔ قال صلعم کنت نهتیکم عن زیارة القبور فزوروها والحدیث ورد فی المساجد لیس معناها المشاهد لان المساجد بعد المساجد الثلاثة متماثلة ولا بلدة الا وفیها فلا معنی للرحلة الی مسجد آخر واما المشاهد فلا تتساوی بل برکة زیارتها علی قدر درجاتهم عند الله نعم لو کان فی موضع ....

لا مسجد فیه فله ان یشد الرحل الی موضع فیہ مسجد وینتقل الیه بالکلیة ان شاء. ثم لیت شعری هل یمنع هذا القائل من شد الرحال الی قبور الانبیاء مثل ابراهیم وموسیٰ ویحییٰ وغیرهم علیهم السلام. فالمنع من ذالک فی غایة الاحالة. واذا جوز ذالک قبور الاولیاء والعلماء والصلحاء فی معناها فلا یبعد ان یکون ذالک من اغراض الرحلة کما ان زیارة العلماء فی الحیٰوة من المقاصد. انتهیٰ.

وآنچه در موطای امام مالک از ابوہریرہؓ مروی ست قال. لقیت بصرة ابن ابی بصرة الغفاری فقال من این اقبلت؟ فقلت من الطور. فقال لو ادرکتک قبل ان تخرج الیه ماخرجت. سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول لا یعمل المطی الا الی ثلاثة مساجد الی المسجد الحرام والی مسجدی هذا والی مسجد ایلیا او بیت المقدس لیشک: انتهیٰ

مطابق است بہمین معنی این حدیث کہ مذکور شد بمراتب. وموید ست برای مقصود ما. بدلیل آنکہ رفتن ابوہریرہؓ جانب طور بقصد صلوٰة شده بود. نہ بقصد زیارت طور. روی احمد والبزار عن ابی بصرة فی مسند هما. والطبرانی فی الکبیر والاوسط من روایة عمر بن عبد الرحمٰن بن الحارث بن هشام المخذومی المدنی انه قال لقی ابو بصرة الغفاری اباهریرةؓ وهو جاء من الطور فقال من این اقبلت؟ قال من الطور صلّیت فیه. قال لو ادرکتک قبل ان ترحل ما رحلتُ انی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد الحدیث. قال العینی ورجال اسناده ثقات وطبرانی در صغیر از ابی سعید مقبری از ابوهریرهؓ مثل آن روایت کرده. وروی ابوجعفر الطحاوی

فی مشکل الآثار عن سعید بن ابی سعید المقبری عن ابی ہریرۃ انہ قال اتیت الطور فصلیت فیہ فلقیت جمیل بن بصرۃ الغفاری فقال من این جئت؟ فاخبرتہ فقال لو لقیتک قبل ان تاتیہ ما جئتہ سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا یضرب المطایا الا الی ثلاثۃ مساجد المسجد الحرام و مسجدی ھذا و مسجد ایلیا۔ انتہی

وفی التقریب بصرۃ بن ابی بصرۃ الغفاری صحابی بن صحابی والمحفوظ ان الحدیث لوالدہ ابی بصرۃ

بہر کیف بصرہ یا ابو بصرہ کہ از ابو ہریرہ رض را از رفتن طور منع کرد۔ ازیں جہت بود کہ اتفاق رفتن او در آنجا بقصد صلوٰۃ شدہ بود۔ و مردم در آں وقت طور را کہ مہبط انوار تجلیات الٰہی بودہ و حق سبحانہ تعالیٰ کلام کردہ بود آں با موسیٰ علیہ السلام محل افضلیت صلوٰۃ می دانستند چنانچہ از مسند امام احمد بروایت ابو سعید خدری رض گذشت کہ صلوٰۃ طور را پیش او مذکور کردند۔ فقال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا ینبغی للمطی ان یشد رحالہ الی مسجد یبتغی فیہ الصلوٰۃ غیر المسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ و مسجدی ھذا پس ازاں صاف ظاہر است کہ منع ابو سعید خدری رض از رفتن جانب طور بقصد ادراک فضیلت صلوٰۃ نہ ازاں ست کہ نص دال بر منع مذکور ست۔ چہ دریں حدیث کہ او روایت کرد مستثنیٰ منہ مذکور ست۔ و آں لفظ مسجد ست و ظاہر است کہ طور مسجدی نیست از مساجد۔ بلکہ ایں حکم از روی قیاس ست ہمچناں قیاس کرد بصرہ ہم بر اصل چرا کہ علت حکم در اصل یعنی حدیث مذکور عبادت و طاعت او سبحانہ ست۔ و نہی از شد رحال جانب ہیچ مسجدی سوای مسجد ثلاثہ نیست الا لاجل طاعتہ اللہ و عبادتہ۔ پس ہر جا کہ ایں علت موجود باشد طور آں کان او محل عبادۃ نبی من الانبیاء او ولی من اولیاء اللہ ایں حکم بر آں

منترتب خواہد شد۔ وظاہر اہمین ست مراد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی در حجۃ اللہ البالغہ۔ ومصفا ومستوی شرح موطا۔ قال فی حجۃ اللہ البالغہ والحق عندی ان القبر ومحل عبادۃ ولی من اولیاء اللہ والطور کل ذالک سواء فی هذا النہی۔ واللہ اعلم۔ وقال فی المصفی۔ ایا نمی بینی کہ بصرہ غفاری نہی را شامل طور داشت وابوہریرہ را از طور منع کرد واللہ اعلم۔ وقال فی المستوی قلت مدلول هذا الحدیث ان یکون شد الرحال الی غیرها المعنی القربۃ و تخصیص المکان منہیا عنہ۔ ولعل الحکمۃ فیہ السد عما کان اهل الجاہلیۃ یفعلونہ من اختراع مواضع یعظمونها برائیهم انتہی۔

چہ ازیں عبارت ظاہرست کہ مقصود آن افضل المحدثین دریں مقام آنست کہ سفر بجانب مشاہد متبرکہ از قبور اولیاء ومحل عبادت ایشاں وطور وامثال آن بقصد عبادت اللہ والتبرک والتوسل بہا حال العبادۃ فی هذہ المواضع بخصوصہا رجاء لتضاعف الاجر والثواب غیر جائز بالقیاس المستنبط من الحدیث ومن فہم غیر هذا من کلامہ فقد وقع فی حیص و بیص پس واضح گردید کہ بر منع سفر کہ محض برائی زیارت قبور باشد۔ تمسک بایں حدیث نمودن غایت جہل ونادانی ست۔ نہ این حکم از روی قیاس ست کہ استنباط آن از حدیث مذکور توانند کرد۔ لعدم کون علۃ الحکم مشترکۃ بین الاصل والفرع چرا کہ ظاہر است کہ علت حکم نہی شد رحال در حدیث خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام قصد طاعت وعبادت حق سبحانہ تعالےٰ است بالاتفاق بین الحنفیۃ والشافعیۃ وآن مفقود ست در زیارت قبور کہ مقصود از ان صرف دعا واستغفار ست۔ ونہ نہی مستفاد از حدیث شامل ست۔ ہر نحو سفر را بہر علتی کہ باشد چہ خصم ہم قائل بایں عموم نیست وچون تواند بود کہ سفر بہر مکان وبہر

مقصود ممنوع باشد و الا برای جهاد و ہجرت بسوی بلدہ از بلاد اسلام و تعلم علم واجب دبرو الدین و زیارت علمای صالحین و اخوان . و سفر از برای تفکر و تدبر در آثار صنائع خدای عز و جل و اعتبار بمخلوقات و عجائب ملکوت و مثل عادات او که مشروعیت آن از آیات کثیرہ کتاب اللہ ثابت ست . نحو سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین . و نحو ذالک فاطمینہ درست نباشد و ما هو الا جهل عظیم . و ہرگاہ حرمت یا کراہیت سفر جانب قبور اولیاء و صلحاء محض برای زیارت از ہیچ دلیل شرعی ثابت نشد . پس خالی نیست کہ یا این فعل واجب باشد و یا مستحب یا مباح . ظاہر مستحب ست . زیرا کہ امر فرمود حضرت صلعم بزیارت قبور مطلقاً و مقید نکرد باشخاص و اوقات و بعد و قرب مقابر و المطلق یجری علی الاطلاق کما تقرر فی الاصول فی صحیح المسلم عن بریدۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال نہیتکم عن زیارۃ القبور فزوروہا . و روی احمد عن علی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال انی نہیتکم عن زیارۃ القبور فزوروہا . الحدیث و عن ابی مسعود ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کنت نہیتکم عن زیارۃ القبور فزوروہا فانہا تزہد

قال الشیخ الامام محمد بن یوسف الزرندی المدنی المحدث فی بغیتہ المرتاح الی طلب الارباح . و مما یدل علی جواز السفر لزیارۃ القبور قولہ صلعم زوروا القبور و فی لفظ آخر کنت نہیتکم عن زیارۃ القبور فزوروہا و امرہ صلی اللہ علیہ وسلم بزیارتہا . دلیل علی جواز السفر و الرحلۃ الیہا اذا کانت بعیدۃ فلا یختص ذالک بکونہا فی البلد او بقربہا . انتہی

و اختیار کردن امر برای استحباب درین قول صلعم با آنکہ صیغہ امر بعد حضر برای وجوب ست نزد عامہ حنفیہ از برای آن ست کہ خصم را مجالی گفتگو

قال النسائی و تفرد بہ الا احمد و رواہ ابن ماجہ (؟)

باقی نماند۔ چہ صیغۂ امر بعد حضر ضرورست کہ جانب فعل در آن راجح باشد بر جانب ترک فعل دیگر۔ وادنی آن استحباب ست بسبب استوائی طرفین در اباحت مثل امر لطلب رزق وکسب معشیت بعد انصراف از جمعہ۔ عن سعید بن جبیرؓ اذا انصرفت من الجمعۃ فساوم بشیء وان لم تشتره۔

دبنا برانست کہ زیارت قبور مستحب است نزدیک جمہور۔ ونوویؒ گوید کہ اجماع ست بر آن۔ وابن عبد البر وجوب آنرا از بعضی علماء نقل کردہ۔ وہمچناں ست نزد ظاہریہ کما فی المواھب اللدنیہ والمرقاۃ واگر صیغۂ امر بعد حضر برائی اباحت باشد چنانکہ مذہب بعض ست آنگاہ نیز افادہ آن برای جواز شد رحال بسوی قبور ظاہر ست۔ زیرا کہ در صیغ امر برای اباحت کہ در کتاب ملک علام واحادیث افضل الانام واقع شدہ۔ اتیان فعل مطلوب مقید بمحل اقامت شخص مامور نیست نحو کلوا مما رزقکم اللہ واذا حللتم فاصطادوا

ہمچناں ست حال فزوروھا کہ اجازت قبور عام ست۔ خواہ بسفر باشد وخواہ بغیر سفر۔ نہ اینکہ مراد آن باشد کہ زور وہا فی بلدکم او بقرب بلدکم بلا شد الرحال الیہا۔ اگر گوئی کہ در سفر برای اصطیاد وطلب رزق ایہام معصیت وشرک نیست۔ بخلاف سفر جانب قبور۔ گوئیم کہ مقصود ما از زیارت قبور زیارتی کہ وارد شد بآن سنت نبی صلعم یعنی الدعاء للاموات والاستغفار لہم وایصال النفع الیہم بالدعاء وتلاوۃ القرآن و معاملہ با قبور کہ خلاف شریعت باشد چنانکہ بسفر ممنوع ست در حضر ہم مذموم وفعل مردم جہال از عوام از پایۂ اعتبار ساقط ست وبسبب کثرت حصول فیوض وفتوح از ارواح مقدسہ اولیاء جای انکار دراں نماندہ ونزد صوفیۂ کرام بمنزلہ مشاہدات ومحسوسات ست وآثار عجیبہ ومنافع عظیمہ دراں یافتہ اند وسر انتفاع از زیارت قبور واتیان مشاہد مشرفہ آن ست کہ نفس را دو گونہ علاقہ با بدن حاصل ست یکی از جہت صورت شخصیہ بدن معین مخصوص وبموت لا محالہ این علاقہ منقطع

شود و دیگر از جہت مادہ محفوظة التشخص فی ضمن اینہ صورة کائنة بدنیة او
ترابیة وغیر ذالک . وایں علاقہ بموت باطل نشود بلکہ باقی ماند . پس نفس مفارقت
کردہ از بدن ہمیشہ متوجہ و متوقع مادہ بدنیہ خود باشد . از مقولہ سفر کردہ کہ با دخانہ
و منزل خود کند . پس ہرگاہ نفس مومن و صالح باشد ہر آینہ مورد اشراقات
انوار الہیہ و فیوضات ربانیہ گردد و نفس زائر ہرگاہ بتوجہ تمام بر قبر مزور حاضر شود
ایں حضور مزور را حضور و صحبت او داند . لامحالہ از فیض وارد بنفس مزور پرتوے
در نفس زائر افتد و بقدر استعداد از آن منتفع شود و متکلمین دیگر دلائل عقلیہ آنرا
ثابت کردہ اند . امام فخر الدین رازی گوید ہرگاہ بیاید زائر نزد قبر حاصل می شود
نفس اورا تعلقی خاص بقبر چنانکہ نفس صاحب قبر را . پس بسبب ایں دو تعلق
حاصل میشود . میان ہر دو نفس مقابلہ معنوی و علاقہ خاص اگر نفس مزور قوی
تر باشد نفس زائر مستفیض گردد و علامہ تفتازانی گفتہ نفع میرسد بزیارت قبور زیرا
کہ نفس مفارق را نحو تعلقی ہست ببدن و بتربتی کہ دفن کردہ شدہ است . دران
ہرگاہ زیارت کند زندہ مر آن تربت را متوجہ شود بسوی نفس سمت حاصل
می شود . میان ہر دو نفس ملاقات و اضافات و اینکہ گفتیم حال سفر مباح
ست برای زیارت قبور مومنین و سفر مستحب برای زیارت قبور اولیاء و صالحین
یا برای ادائے حق اہل قبور چنانکہ در حدیث آمدہ کہ مانوس ترین حالتے کہ میت
را حاصل شود در وقتی ست کہ یکی از آشنایان او زیارت قبر او کند و احادیث
دریں باب بسیار ورود یافتہ .

اما سفر برای زیارت مرقد مطہر منور نبینا افضل الاولین والآخرین . سید
المرسلین امام المتقین حامل لواء الغر المحجلین . رحمة للعالمین شفیع المذنبین . اول
شافع و اول مشفع یوم الدین علیہ الصلوة والسلام الی انقضاء السموات والارضین
افضل مندوبات بل قریب واجبات ست .

فی شفا القاضی عیاض شد الرحال الی قبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم واجب. یرید بالوجوب ههنا وجوب ندب وترغیب وتاکید چه زیارت روضه فیض اساس آسمان کرپاس آن افضل کائنات علیه افضل الصلوات واکمل التحیات از اعظم قربات واجل طاعات ومفضی الی اعلی الدرجات ست. واحادیث صحیحه که درین باب می آید اختصاص آن باہل مدینه وقرب جوار آن نبوده است۔

قال الشیخ احمد القسطلانی من اعتقد غیر هذا فقد انخلع من ربقة الاسلام وخالف الله ورسوله وجماعة العلماء الاعلام. و بعضی علماء قریب وجوب وبعضی وجوب آن گفته اند. ونزد جمهور فقهائے حنفیه از افضل مندوبات و اوکد مستحبات قریب بدرجهٔ واجبات ست۔

فی فتح القدیر قال مشائخنا رحمهم الله زیارة قبره علیه الصلوٰة والسلام من افضل المندوبات وفی مناسک الفارسی وشرح المختار انها قریبة من الوجوب لمن له سعة. انتهی۔

وفیه. والحج ان کان فرضاً فالاحسن ان یبدأ به ثم یثنی بالزیارة وان کان نفلا کان بالخیار

فی الدر المختار وزیارة قبره الشریف مندوبة بل قیل واجبة لمن له سعة ویبدأ بالحج لو فرضاً ویخیر لو نفلاً انتهی۔

فی الطحطاوی الذی فی المنح یقرب من درجة الواجبات وفی مناسک الطرابلسی انها قریبة الی الواجب فی حق من کان له سعة. ویبدأ بالحج لو فرضاً لان الحج فرض والزیارة تطوع ولو بدأ بالمدینة جاز منه انتهی۔

وابن جوزی که نقاد فن حدیث ست. در وفای خود باسناده از ابن عباس روایت کرده. قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من حج فزار قبری بعد موتی کان کمن زارنی فی حیاتی. واز ابن عمرؓ روایت کرد قال قال النبی صلی الله

علیہ وسلم ۔ من زار قبری فقد وجبت لہ شفاعتی وعن انس بن مالک
ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من زارنی بالمدینۃ محتسباً کنت لہ
شفیعاً وشہیداً یوم القیمۃ ۔ قال ابن الہمام فی فتح القدیر روی
الدارقطنی والبزاز عنہ علیہ السلام ۔ من زار قبری وجبت لہ شفاعتی
واخرج الدارقطنی عنہ من جآئنی زائراً لا یعلمہ حاجۃ الا
زیارتی کان حقاً علی ان اکون لہ شفیعاً یوم القیامۃ ۔ و
اخرج الدارقطنی ایضاً من حج وزار قبری بعد موتی کان کمن
زارنی فی حیاتی ۔ وملا علی قاری در شرح شفای قاضی عیاض
در شرح قولہ صلعم و اعطیت الشفاعۃ وبیان شفاعت یعنی
در مقام محمود گفتہ ۔ ولہ صلعم شفاعات اخرھا شفاعتہ لمن زارہ
علیہ السلام لما روی ابن خزیمہ فی صحیحہ عن ابن عمر مرفوعاً ۔ من
زار قبری وجبت لہ شفاعتی ۔ قال ابن الہمام فی فتح القدیر
فی آداب زیارۃ قبر النبی صلعم ۔ یسال اللہ حاجتہ متوسلا
فی حضرۃ نبیہ علیہ الصلوۃ والسلام ۔ واعظم المسائل و
اہمہا سوال حسن الخاتمۃ المغفرۃ ثم یسال النبی صلعم الشفاعۃ فیقول
یا رسول اللہ اسالک الشفاعۃ یا رسول اللہ ۔ اسالک الشفاعۃ
والتوسل بک الی اللہ فی ان اموت مسلماً علی ملتک ۔ وسنتک
انتہی ۔

واین احادیث کہ در باب زیارت قبر مطہر منور حضرت نبوی صلعم مذکور
شد ۔ آن ہست کہ نزد محدثین ناقدین مثل ابن جوزی وغیرہ وائمہ حنفیہ
بصحت رسیدہ ۔ وگرنہ احادیث بسیار درین باب نقل می کنند ۔ واما
آثار سلف صالحین در اختیار سفر از برای زیارت سید انام علیہ الصلوٰۃ والسلام
مشہور در کتب معتبر سیر مذکور ست ازانجملہ آمدن بلال ست در زمان خلافت

حضرت عمرؓ از شام بمدینہ کہ ابن عساکر از ابو درداءؓ روایت نمودہ۔ و از آں جملہ گفتن حضرت عمرؓ بعد فتح شام و مصالحت با اہل بیت المقدس بکعب احبار در حال مشرف شدن او باسلام کہ ای کعب خواہی کہ با ما بمدینہ در آئی و زیارت سید انبیاء کنی صلعم۔ گفت یا امیر المومنین انا افعل ذالک۔ و لعد

از قدوم بمدینہ منورہ اول کاریکہ عمرؓ ابتدا کرد سلام حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم بود۔ و این فعل آنجناب دلیل ست بر دانستن زیارت آں حضرت صلعم۔ از اہم امور و اقدم کارہا ہمچناں بود عمل ابن عمرؓ فی الموطا لمحمد فی باب زیارۃ قبر النبی صلعم اخبرنا مالک اخبرنا عبد اللہ بن دینار ان ابن عمرؓ کان اذا اراد سفرا او قدم من سفر جاء قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فصلی علیہ و دعا ثم انصرف و عبد الرزاق ہم باسناد صحیح این روایت آوردہ و در موطای امام مالک۔ نیز این روایت مذکور ست۔"

باب ۱۱

متفرق تحریریں

فارسی خط : فارسی نثر کی مشہور کتابیں سہ نثر ظہوری ۔ پنج رقعہ ، مینا بازار شبنم شاداب ، انشائے طاہر وحید ، انشائے ابوالفضل ، انشائے بیدل وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جن میں کوئی مراسلت تشبیہ و استعارہ سے خالی نہیں ۔ رنگین بیانی نازک خیالی اور معنی آفرینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے خصوصیت کے ساتھ ظہوری ، ابوالفضل اور بیدل تو فارسی اقلیم انشاء کے فرمانروا ہیں ۔ ان کے بلند اور نازک خیالات ، خوبصورت اور خوشنما ترکیبیں ، لفظوں کی عمدہ تراشیں معانی کی نزاکتیں طبیعتوں کی بلند پروازیاں ، صنعتوں کے ہجوم جواب نہیں رکھتے ۔ انھوں نے جس فقرہ کے ساتھ فقرہ جوڑا ہے وہی اس کا جوڑ ہے ۔ مجال نہیں کہ ایک کو اٹھا کر کوئی دوسرا فقرہ اسکی جگہ رکھا جا سکے ۔ عبارت کی شان شگفتگی بیان ۔ ادائے مطلب کے انداز عین برجستہ اور مناسب ، لمبے لمبے فقرے ۔ ان کا جز جز ایک دوسرے کی پشت پناہ ۔ جس مضمون کو دیکھیے سنجیدہ برگزیدہ خیالات ہیں انھیں ایسے مناسب ۔ برجستہ ، برمحل الفاظ و عبارت میں ادا کیا ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں ۔

مرزا غالب کے عہد میں جو لوگ فارسی انشاء کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے وہ زیادہ تر انشاء پردازی میں انھیں کی پیروی کرتے تھے ۔ خود مرزا غالب بھی انھیں بزرگوں کے انشاء کے دلدادہ تھے ۔ مولانا صہبائی ہوں یا مصطفےٰ خاں شیفتہ نواب ضیاء الدین نیر رخشاں ہوں یا حکیم مومن خاں مومن ۔ نثر میں اسی روش پر گامزن تھے ۔ مفتی صدر الدین آزردہ کی فارسی انشاء کا جو نمونہ محمد حسین شاہجہانپوری

نے "ریاض الفردوس" میں اور سرسید احمد خاں نے "آثار الصنادید" میں دیا ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی فارسی انشاء میں ظہوری اور ابوالفضل کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ مندرجہ ذیل ان کا فارسی خط پڑھ کر ان کی قادر الکلامی، رنگین بیانی اور معنی آفرینی کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔

چنانچہ مفتی صاحب لکھتے ہیں۔

"رہین منت بخت بیدارم کہ من بہیچ درحساب راکہ چوں حرف باطل بغلط بر زبان گوہر فشاں نمی گذشت، از روستائی بے اعتباری برآوردہ روشناس شہرستان صحبت خطاب گردانید۔ و از نشیب گاہ فراموشی بالا دادہ بر فراز والا پائگی یاآوری رسانید۔ یاوری طالع راگذری لبر وقت بیدلان افتاد کہ دورگردان بزم دلفروز راکہ چوں غبار شکست درکنار آں راہ نشیناں ستندی یافت، از رہ سپری وادی بے آرامشی رہانیدہ از نزدیکی بساط حضور گزیدہ سامانے فراہم داد۔ و کاروان نسیم مصر در بیت الحزن بار اقامت برکشاد و سار بان زمام ناقہ لیلیٰ بکف اختیار قیس شکستہ پا داد۔ قطرہ ام دریا، مسم کیمیا۔ خزفم گوہر، خارخسم گل تر۔ شامم رد کش روز۔ بامدادم رشک نوروز۔ دردم دوا گردم توتیا۔ خوشہ ام خرمنے۔ سبزہ ام سمنے یاسم امید۔ خزانم بہار جاوید گردید پستم رابلندی۔ طالع ام را ارجمندی شبم را سحر، نفسم را اثر، سرافگندیم را سرفرازی، شکستہ خاطریم را دلنوازی پدید آمد ہمانا ہمایوں، فال، طائر سایۂ اقبال بگترد کہ خطاب سلیمان بہ مور ناتواں رسانید و زبان حال را بر دان پرور کریم اِنّی اُلقِیَ اِلیّ کتابٌ کریم گویا ساخت۔ سراپائے دل را شگرف کشایشی روآوردہ و پیشگاہ سینۂ بوالعجب انشراحی فرد گرفت، ناظر پریشاں را پیرایہ فزونی جمعیت و مایۂ تنومندی آرامش حاصل شد۔ نسیم الطاف ندیم بتازگی وزید و گلشن عاطفت از سر نو شگفت، چوں از دور افتادگان از یاد رفتہ و فراموشان از طاق دل افتادہ پرسش و جوئے باماں بود خاطر حسرت اندوز

بگوناگوں کامرانی ہا برآمود و بدیع انبساطی روزی روزگار اخلاص سرشت گردید بہیت
بنیافت صبحدم آغوش دوست از دوست   تمنعی کہ دل از ذکر ایں پیام گرفت

ازاں باز کہ بار فصل خصومات را بر گردن گرفتہ انفاس گرامی را بنا بالیف
دادہ ام ۔ نقوش سخن گذاری و نکتہ سرائی از ساخت ضمیرم بکیہ قلم ستردہ ۔ و تار
عنکبوت نسیان بر زوایائے سراوقات آں یکسر تنیدہ آمد ۔ و راس المال
متخیلات آں کہ در خزانہ خیال داشت تباراج اختلاط مفتی از پیت منشان
مست فطرت ، کہ حفظ ضوابط معمولہ عدالت را عرش المعرفۃ بالغ خودی و
سدرۃ المنتہائے دانش پژوہی شمردہ اند ۔ دادہ و افزونی تعلق و فراوانی شغلہائے
دیگر ضمیمہ آں نسبت دوست ، مایہ آسودگی چندانے بدست نیارستم آورد
کہ لختی آئین سخن طرازی و نکتہ سنجی را بکار برم ۔ مگر چوں آہنگ ایں صناعت
را با گوہرم سرشتہ اند ۔ گاہ گاہ تسبیح آں تار پود تسبیح ایں علائق را از ہم میگسلا
نند و ہر گاہ بہمیں ہدیہ نو آزادگان طبع از احیائے نورانی بر فراز اعتبار منزل
میگیرد ۔ ہمچو بلبلے کہ بدستاں سرائی بلبل دیگر در چمن بخروش آید ۔ و آہنگ
نالہ ساز دھد ۔ بے اختیار نوائے جاں خراش از خاطر بریاں برمی زند و بسبر
جوش شوق بے خودی جوش بے ہنگام ناز از جا میرود ۔ ہر چند از آشوب درونی
و بیرونی بے راہہ می روم و سخن را آئینے کہ باید گذاردہ ام و گزین کاری بسزا بر
نخواستہ ام ۔ اما فرو ہیدہ فراہنگان انصاف گوہر و سخن سرایان دیدہ وران
را مرسلۃ الصدر روح و روان توام فہمید ۔ اکنون از حال عم بزرگوار
می نویسیم شفائے الیشان از نادرہ حکمت داد ار جہاں آفریں است و مایہ حیرت دران
روایات بکار ساز حقیقی روئے نیاز آوردند ۔ جلائل نعم الہیٰ را دریافتند ۔ شرح آں
بکالبد گفتار در نگنجد ۔ فی الجملہ بسر نوشت آسمانی طیلسان صحت بر دوش گرفتہ
رو بحصار آوردہ اند در حصار حراست علی الاطلاق منزل گرفتہ

" والسلام محمد صدر الدین ختم اللہ بالحسنیٰ "

ایک نادر عربی تحریر کا عکس

مفتی صدرالدین آزردہ کی خدمت میں ملک کے اطراف و جوانب سے مختلف طرز کے استفسارات بھی آیا کرتے تھے جس میں کبھی عقائد کلام، فلسفہ منطق اور فلسفہ و تصوف سے متعلق سوالات ہوا کرتے تھے اور کبھی دینی مسائل میں ان کی رائے طلب کی جاتی تھی۔ بعض لوگ ان کی عربی دانی اور عربیت میں وسعت معلومات کی بنا پر نحو و صرف اور بلاغت کے بعض اہم مقامات کے متعلق بھی استفسارات کرتے تھے۔ مفتی صاحب کے فتاوے اور جوابات تو محفوظ نہیں رہے۔ البتہ ان کی ایک نادر عربی تحریر محقق جلیل مرحوم ڈاکٹر محمد شفیع صاحب کو ہاتھ لگ گئی۔ جس کا عکس انھوں نے "اورینٹل کالج میگزین لاہور" میں شائع کیا۔ مندرجہ ذیل تحریر ہم ڈاکٹر صاحب موصوف کے تعارف کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

"دو مختلف رنگ کے کاغذوں کو جوڑ کر ایک لمبا کاغذ بنا لیا گیا ہے۔ طول ۲۴ انچ × عرض ۵ ۱/۲ انچ اس پر ایک طرف سائل نے بغیر دستخط کے ایک نحوی سوال لکھا ہے اور علماء سے اس کا جواب مانگا ہے۔ پہلے مفتی صدرالدین صاحب نے جواب لکھ کر دستخط کیے ہیں اور اپنی مہر لگائی ہے۔ اس طرح:

محمد صدرالدین الملقب بصدر الصدور۔ واللہ اعلم بذات الصدور۔

مہر پر ۱۲۴۱ درج ہے۔ یہ مفتی صاحب کی صدرالصدوری سے پہلے کا زمانہ ہے۔ ساتھ ہی مولوی مملوک العلی کے دستخط ہیں۔ (ان کے حال کے لیے دیکھیے تذکرۂ اہل دہلی ص ۹۰)

مفتی صاحب کے بعد ایک اور صاحب نے جواب لکھا ہے اور دستخط

گیے ہیں اور مہر لگائی ہے ۔ وہ ہیں محمد حیات لاری (ایک مولانا محمد حیات پنجابی کا ترجمہ تذکرہ اہل دہلی ص۱۳۳ میں ہے ۔ مگر لاری کی نسبت وہاں مذکور نہیں ۔)
ایک اور مہر لگی ہے جس پر لکھا ہے :

ربنا الرحمٰن المستعان ۱۲۳۹۔

معلوم نہیں یہ کن صاحب کی مہر ہے ۔

کاغذ کے دوسری طرف بھی ایک لغوی سوال اور اس کا مختصر سا جواب بھی دیا ہے ۔ اس پر مذکورہ بالا تینوں مہریں لگی ہیں ۔ اور مولوی مملوک العلی کے دستخط ہیں ۔

اب ہم ذیل میں یہ سوال اور جواب درج کرتے ہیں ۔ صرف اس حصے کا عکس بھی شامل کرتے ہیں جو مفتی صدر الدین صاحب کے اپنے خط میں تحریر ہوا ہے ۔ اور جس پر ان کے اور مولوی مملوک العلی کے دستخط ہیں اور مفتی صاحب کی مہر بھی ہے ۔

(الف) ما قولکم ایہا المتصفون من العلماء العظام فی ھذہ المعرکۃ قال واحد من المتخاصمین ان اھل العربیۃ قاطبۃ نصّوا علی منع المنع لاجل الضرورۃ الشعریۃ اذ ھی انما تعتبر فی صرف المنع دون العکس وقال الآخران صرف ما لاینصرف وامتناع صرف المنصرف کلیہما من الضرورات الشعریۃ قال الزمخشری :

ضرورۃ الشعر عشر عدّ جملتہا وصل وقطع وتخفیف وتشدید
مدّ وقصر واسکان وتحریک ومنع صرف وصرف ثم تعدید

وقال ابن مالک فی التسہیل (یعنی تسہیل الفوائد وتکمیل المقاصد) ویمتنع صرف المنصرف اضطرارا ، وفی الالفیۃ (طبع ڈیساسی ، پیرس ۱۸۳۳ء ص ۹۴)

ولا ضطرارا وتناسب صُرِف ذوالمنع والمصروف قد لاينصرف

ثم اجاب الاول بان المراد من قولی " اهل العربية قاطبة " جمهور اهل البصرة وبعض اهل الكوفة متمسكين بان الضرورة الشعرية ترد الاشياء الى اصولها فجاز صرف غير المنصرف لا عكسه . واما " مرداس " فمعارض بصحة " شيخی " فلا يكون من باب الضرورة بل شاذ مخالف للقياس وقواعد الجمهور والشاذ لايصلح حجة ، نقال الآخر نعم جواز منع الانصراف للضرورة مذهب الكوفية والاخفش وابو القاسم بن برهان ربرا كلمان تكمله ١ : ٤٩١)

والفارسی وثعلب والزمخشری وابن مالك وابن هشام والرضی وعدم جوازه مذهب باقی البصرية والی موسی لكن التاويل المذكور غير صحيح اذ لفظ " الاهل " اسم الجمع وقد اكد بقوله " قاطبة " بالتاكيد الشمولی الرافع لاحتمال المجاز وهو قوله " قاطبة " . وقد قال العلامة ناقلا عن شفا الشيخ ان قاطبة سور الموجبة الكلية فيكون القول المذكور موجبة كلية فكيف يصح تاويلها بالجزئية المذكورة واذ قد اقر هذا القائل بان مذهب اكثر الكوفية جواز المنع فلا محالة تصدق السالبة الجزئية اعنی بعض اهل العربية لم ينصوا على منع المنع لاجل الضرورة وهی نقيض قوله الاول واما القول بان الضرورة ترد الاشياء الى اصولها دون العكس فممنوع بان الاصل فی همزة الوصل فی الدرج هو السقوط وكثيرا ما لا يسقط للضرورة وكيف لا اذا ثبت الضرورة حل المحظور ردّ الاصل الى الفرع او بالعكس . واما قوله " فمعارض بصحة " شيخی آه " فاجاب عنه صاحب المنهل بان " الرواية بذالك

ای بمرداس ثابتة فی صحیح البخاری (۹) بلا شك والرواية الاخری بتقدیر ثبوتها لا تعارضها وبان الکوفیة لم یستندوا الی هذا البیت بل انشدوا علیه شواهد کثیرا انتهی" وقال الرضی" الانصاف ان الروایة لو ثبتت عن ثقة لم یجز ردها وان ثبتت هناك روایة اخری انتهی مع ان قول الکوفیة هو الحق الصحیح لما نقل الخالد الازهری (براکلمان. تکملہ ۲ : ۲۲) فی شرح الشرح للالفیة عن ابن هشام فی ذکرامتناع الصرف وهو الصحیح لکثرة ما ورد منه وهو من تشبیه الاصول بالفروع انتهی. ثم نقل بعد ذالك نحوا من عشرین بیتا من الاسناد جعلوا فیها المنصرف غیر منصرف. فالمسئول عن العلماء المنصفین ان یبینوا ان قول المخاصم الاول وتاویله صحیح او قول الثانی و اعتراضه حق وتاویل الاول ابعد عن الطبائع السلیمة والقرائح المستقیمة بینوا توجروا۔

" قول القائل الاول غیر سدید وتاویله بارد وما قال القائل الثانی فجدیر بالقبول وما اورده علیه فهو وارد والتحقیق ان صرف ما لا ینصرف یجوز للضرورة اتفاقاً وذالك لان الضرورة ترد الاشیاء الی اصولها واصل غیر المنصرف ان یکون منصرفا ومنع لبعض الکوفیین صرف افعل من کذا فی الضرورة ایضاً لایفد اصل الجواز اذ الکلام فی الضرورة. واما عکسه فمما اختلف فیه جوّز بعضهم لکن لا مطلقا بل بشرط العلمیة لقوتها بکونها شرطاً لکثیر من اسباب مع کونها سبباً ، متمسکاً بقوله:

وما کان حصن ولا حابس　　　یفوقان مرداس فی مجمع

فان الشاعر منع فی مرداس لکونه علماً۔ والقول بان التمسک غیر مستقیم حیث ردی "شیخی" مکان "مرداس" رد بان الروایة بذلک ای بمرداس ثبتت عن الثقات۔ ومنع بعضهم مستدلاً بان لیس فیه رد الشئی الی اصله والضرورة لا یخرج الاشیاء عن اصولها ولهذا اجاز قصر الممدود فی الشعر لان المقصور اصل الممدود دون مد المقصور الا نادراً۔ والضرورة مطلقاً لا یرخصه والا جاز تنوین المبنی ولیس کذلک حتی قیل فی قوله ؎

سلام اللّٰه یا مطر علیها ولیس علیک یا مطر السلام

شاذ قبیح فثبت من هذا التحقیق ان بعضهم جوز وامنع صرف المنصرف فکیف یصح قول القائل ان اهل العربیة قاطبة نصوا علی منع المنع۔ ولولا مخافة توجیه القول بما لا یرضی قائله لقلت ان مراد القائل "الفصحاء من اهل العربیة" ولعلهم قاطبة یحترزون عن ذالک۔ او مراده "ان امتناع صرف المنصرف لا یجوز مطلقاً سواء کان علماً او غیره" هذا ما ظهر لا حوج المربوبین (دستخط) محمد صدر الدین الملقب بصدر الصدور واللّٰه علیم بذات الصدور (مہر) محمد صدر الدین (۱۲۴۰) (دستخط) مملوک العلی عفی عنه۔

ظهر من کلام القائل الثانی بنقله کلام الثقات ان منع المنصرف ایضاً جائز للضرورة عندهم ورجحه بدر الدین علی بن قاسم شارح الالفیة بقوله "وهو الصحیح لثبوت سماعه" انتهی وشرط العلمیة عند بعض المتاخرین حیث قال هذا الشارح ایضاً وفصل بعض المتاخرین بین ما فیه العلمیة فاجاز منعه لوجود احدی العلتین وبین ما لیس کذلک فصرفه ویوید ه ان ذالک لم یسمع

الّا فی العلم واما الضرورۃ فلیس بشرط ایضا عند البعض کما قال واجاز قوم منہم احمد بن یحی منع صرف المنصرف اختیارا انتہی ودفعہ کون الضرورۃ ترد الاشیاء الی اصولہا حق وبعد التاویل ثابت بلا شبہۃ وما اورد علیہ فہو وارد لانہ مع کونہ بلا قرینۃ اضافۃ الاہل الی العربیۃ اما للاستغراق او للعہد علی الاول لا یکون التاویل صحیحا وعلی الثانی لا یکون قالبۃ واقعا فی محلہ کما لا یخفی (دستخط) فقیر محمد حیات لاری عفی عنہ واللہ اعلم (مہر) فقیر محمد حیات لاری۔

ما قولکم مدّ اللہ ظلالکم

اعترض واحد من المناظرین ان قول الفاضل البہاری روساء بضمتین سہو الناسخ والصحیح بضم الاول وفتح الثانی کعلماء وقال الآخر لیس کذالک بل عبّر الفاضل البہاری عن فتح الثانی بالضم تغلیباً رعایۃ ضم الاول ورد المعترض الاول بان التغلیب فی حلیۃ اللغات من اشد الممتنعات والا لغت الحلیۃ وتلبست اللغات فالمسؤل من العلماء العظام والاذکیاء الکرام ان قول المعترض وردہ صحیح ام قول المجیب وتاویلہ؟ بینوا بالتفصیل توجروا باجر جزیل۔

قول المعترض وردّہ صحیح وقول المجیب وتاویلہ باطل۔

(مہر) محمد صدر الامین ۱۲۴۱ - دستخط) ہمالودی

العلی عفی عنہ (مہر) ربنا الرحمٰن المستعان ۱۲۳۹۔

(مہر) فقیر محمد حیات لار ے ۱۲۳۹

(اورینٹل کالج میگزین ماہ اگست ۱۹۶۲ء)

عکس تحریر

قول القائل الاول غیر سدید وما دبّر بامره وهو ما قال القائل الثانی فجدیر بالقبول وما اورده علیه فهو
وارد والتحقیق ان صرف ما لا ینصرف یجوز للضرورة اتفاقاً وذلک لان الضرورة ترد الاشیاء
الی اصولها والاصل فی غیر المنصرف ان یکون منصرفاً ومنع بعض الکوفیین صرف افعل من کذا فی الضرورة
ایضاً لانه یضر اصل الجواز اذ الکلام فی الضرورة واما عکسه فمما اختلف فیه جوّز بعضهم لکن مطلقاً
بل بشرط العلمیة لقوتها بکونها شرطاً لکثیر من الاسباب مع کونها سبباً متمسکاً بقوله وما کان
حصن ولا حابس یفوقان مرداس فی مجمع فان الشاعر منع فی مرداس لکونه علماً والقول
بان التمسک غیر مستقیم حیث روی شیخی مکان مرداس ثم قوی بان الروایة بذلک ای بمرداس
تثبت عن الثقات ومنع بعضهم مستدلاً بان لیس فیه رد الشیء الی اصله والضرورة لا تخرج
الاشیاء عن اصولها ولهذا جاز قصر الممدود فی الشعر لان المقصور اصل الممدود دون

مد المقصور الا نادراً و القصر ورد مطلقا لا یرخصه والاجاز تنوین المبنی ولیس کذلک

حتی قیل فی قوله سلام الله یا مطر علیها ولیس علیک یا مطر السلام انه شاذ بحیث

من هذا التحقیق ان بعضهم جوز امتناع صرف المنصرف ضعیف مع قول القایل

ان اهل العربیة قاطبةً نصوا علی منع المنع ولولا مخافة توجیه القول بما لا یرضی قایله

قلت ان مراد القایل الفصحاء من اهل العربیة وهم قاطبة یحترزون عن ذلک اواره

ان امتناع صرف المنصرف لا یجوز مطلقاً سواء کان علماً او غیره هذا ما هو الراجح

محمد صدر الدین الملقب صدر الصدور والله علیم بذات الصدور

باب ۱۲

شاعری

اردو غزل: مفتی صدر الدین آزردہ نہ صرف علوم اسلامیہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ بلکہ شعر و سخن کے میدان میں بھی اپنے معاصرین میں ممتاز تھے وہ فقہ و حدیث و تفسیر ہی میں درجۂ اجتہاد نہیں رکھتے تھے بلکہ اردو ریختہ میں بھی طرز خاص کے مالک تھے۔

عام طور سے اگرچہ ان کی عالمانہ اور فقیہانہ حیثیت ہی نمایاں رہی۔ لیکن احباب اور دوستوں کی محفلوں میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے بھی جوہر چمکے، عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور اپنی نادر الکلامی کا لوہا بڑے بڑے شاعران نغز گفتار سے منوا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فضل و کمال کا جہاں تذکرہ کیا جاتا ہے وہاں اردو کے بلند پایہ شاعروں میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ جیّد عالم دین ہونے ہوئے بھی ایک حسّاس اور خوش مذاق انسان تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بغیر شاعری کے فکر و خیال کے گہر ہائے آبدار نفس کی گہرائیوں سے باہر نہیں نکل سکتے اور نہ انسانیت کا جلوہ بے محابا دیکھا جا سکتا ہے۔ شاعری میں لطافت روح بھی ہے اور زندگی کا کیف بھی۔ کسی شخصیت کا لطیف و گداز پہلو شعر و سخن ہی کے روپ میں لوگوں کے سامنے اجاگر ہوتا ہے۔

انھوں نے ابتدائے شباب ہی میں شعر کے کوچے میں قدم رکھا۔ اس دور کے اساتذہ میں سے شاہ نصیر، میاں مجرم اکبر آبادی کو اپنا کلام دکھلایا۔ پھر نظام الدین ممنون سے مشورۂ سخن کیا۔ اور بعد میں خود اردو کے صاحب طرز سخن سنج بن گئے آزردہ کا مجموعۂ کلام مرتب صورت میں نہیں ملتا۔ لیکن تذکروں میں جتنے اشعار

بھی پائے جاتے ہیں وہ ان کی شاعرانہ حیثیت متعین کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کا سرمایۂ کلام گرچہ بہت مختصر اور تھوڑا ہے لیکن بہت وقیع اور وزن دار ہے اور سب کا سب انتخاب ہی ہے وہ ان کی نسبت اگر یہ کہتے ہیں کہ ؎

جوں سراپائے یار آزردہ　　　　تیرے دیواں کا انتخاب نہیں

تو بڑی حد تک صحیح اور درست ہے۔ ان کے کلام میں شگفتگی و شادابی بھی ہے اور روانی و برجستگی بھی شوخی و بانکپن بھی ہے اور نرمی و گداز بھی شیرینی و حلاوت بھی ہے اور سادگی و پرکاری بھی ان میں طرز دلبری بھی ہے اور انداز دلربائی بھی۔ ان کے اشعار عوام اور خواص سب کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے اور ہر صاحب ذوق کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ آزردہ کے یہاں خیال کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو طرز ادا عام فہم اور بے حد سادہ ہے۔ وہ بے جا اور بے روح مبالغہ کو شعر کے حق میں سم قاتل سمجھتے ہیں۔ وہ شعر میں کسی ایسی گنجلک یا الٹ پھیر کو بھی مذموم سمجھتے ہیں جو اس کی روانی اور موسیقی میں فرق پیدا کر دے وہ بڑے سے بڑے خیال کو بغیر عربی و فارسی کی اوق تراکیب اور مشکل الفاظ کا سہارا لیے نہایت پُر لطف اور مزے دار طریقے سے بیان کر دیتے ہیں اور یہ ان کی خصوصیت اپنے تمام معاصرین میں امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ چناں چہ خود فرماتے ہیں ؎

ریختہ یہ ہے کہ جوں آیت محکم ہے صاف　　　　معنی دور نہیں، لفظ بھی مہجور نہیں

غزل کے علاوہ کسی دوسری صنف میں ہمیں ان کا کلام دستیاب نہیں ہوتا لیکن ان کی غزلوں کے اشعار سراسر درد و اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان میں خیال کی بلندی بھی ہے اور زبان کی صفائی بھی۔ جذبے کی صداقت بھی ہے اور طہارت فکر بھی لطافت اور پاکیزگی کا نمایاں وصف ہر غزل میں ملے گا۔ اسی لیے فرماتے ہیں ؎

آزردہ نے پڑھی غزل ایک میکدہ میں کل　　　　وہ صاف تر کہ سینۂ پیر مغاں نہیں

زبانِ خوش نوا کے ساتھ اگر شاعر کے پاس دل درد آشنا بھی ہو تو متاع گرانمایہ سے کم نہیں وہ شعرا جو تلامذۂ رحمان ہوتے ہیں جن کے کلام میں درد اور تڑپ ہوتی ہے کشش اور جاذبیت ہوتی ہے ان میں یہ وصف اسی وقت پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ ان کا دل درد آشنا ہو۔ میر تقی میر کی شہرت بلند خیالی اور معنی آفرینی کے لحاظ سے نہیں ہے۔ بلکہ اس لیے ہے کہ ان کا کلام درد و اثر اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایسے تیر و نشتر ہیں کہ سنتے

ہی دل میں جا کر پیوست ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح آزردہ بھی اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ ؎

نکلے جستجو میں روز ازل جائے درد کی
آیا پسند دل مرا اس انتخاب میں

میر کے برابر تو نہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آزردہ کے کلام میں بھی درد و اثر ہے۔ ان کے اشعار میں بھی سوز و گداز ہی نمایاں وصف ہے۔ غالباً اسی مناسبت سے انھوں نے تخلص بھی آزردہ اختیار کیا۔ کہتے ہیں کہ وہ شعر بھی بڑی دردانگیز آواز سے پڑھتے تھے۔ اور سننے والا ان کے شعر خوانی کے طریقے سے سخت متاثر ہوتا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں نے انھیں ساٹھ برس کی عمر میں دیکھا تھا۔ "اتحاف النبلا" میں لکھتے ہیں۔

"باآں ہمہ پیرانہ سالی کہ دراں وقت شصت سالہ خواہند بود۔ ذوق شعر و سخن فوق مذاق جواناں عاشق تن بود۔ ہم خود در فارسی و عربی و اردو موزوں میکردند ہم کلام دیگر موزوں طبعان گوش میفرمودند۔ آزردہ تخلص داشتہ اند و بمقتضای آن ہمیشہ از فرط عشق دردلہ و محبت آزردہ خاطر آشفتہ طبع اگریاں بریاں می بودند"

باوجودیکہ آزردہ کے کلام کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ لیکن پھر بھی جو کلام بچ گیا ہے اسے پڑھ کر ہر صاحب دل تڑپ اٹھتا ہے۔ یہ سوز و گداز ان سماجی و تمدنی انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے جن سے اس زمانے کی زندگی دوچار تھی مغلیہ سلطنت کے زوال اور ہندوستانیوں کی بدحالی کا زمانہ تھا۔ انھوں نے ایک نظام اور ایک عہد کو مٹتے اور فنا ہوتے دیکھا تھا۔ لامحالہ اس کا پرتو ان کے کلام پر بھی پڑا ہے۔ اور چونکہ طبعاً حساس تھے اس لیے شعر کے پیرائے میں دردِ دل بھی سنا دیا ہے۔

غزل کی شاعری عشق و محبت کی شاعری ہے۔ تمام غزل گو شعرائے

عشق ہی کی مختلف کیفیات کا بیان کیا ہے۔ مگر چونکہ ہر شاعر کی افتادِ طبع، طرزِ فکر اور وارداتِ قلبی کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے موضوع کی یکسانیت کے باوجود ہر شاعر کا رنگ دوسروں سے جدا ہوتا ہے آزردہ کے معاصرین میں غالب، ذوق، مومن، چوٹی کے شاعر ہیں اور اردو غزل کے امام مانے جاتے ہیں۔ آزردہ شاعر کی حیثیت سے ان کے مقابلے میں تو نہیں کھڑے کیے جا سکتے لیکن ایک شانِ انفرادیت ضرور رکھتے ہیں۔ اور اپنی اسی شانِ انفرادیت کی بناء پر خود ان شعرائے کے نزدیک بھی انکی بڑی اہمیت تھی کوئی ادبی اور شعری مجلس اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک کہ اس میں آزردہ کی شرکت نہ ہو۔

عشق و محبت کا جذبہ ایسا ہے کہ جس سے کوئی فردِ بشر خالی نہیں۔ اور جب یہ شدت اختیار کر لیتا ہے تو نہ اُسے دن کو چین مل سکتا ہے اور نہ رات کو آرام۔ نہ اس کے دل میں سکون ہو سکتا ہے اور نہ آنکھوں میں نیند۔ پریشانی اور بیتابی اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے وابستہ ہو جاتی ہے۔ کبھی نالۂ نیم شبی ہے تو کبھی گریۂ سحری۔ چنانچہ آزردہ کہتے ہیں۔

مختصر حال چشم و دل یہ ہے
اس کو آرام اس کو خواب نہیں

اپنا حال زار بیان کرتے ہیں ۔

نہ دیکھا ہو جو کسی نے حباب میں دریا
وہ دیکھ لے مری چشم پر آب میں دریا

عشق نام ہے جذبۂ فدائیت کا۔ جذبۂ فدائیت پیدا ہو جاتا ہے تو صداقت جلو میں اور خلوص و ایثار اس کے رکاب میں ہوتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک تن من دھن سے اس کے لیے قربانی کا جذبہ نہ ہو۔ آزردہ کے سامنے حصول کامیابی کا یہ

زریں اصول ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ جب رضائے محبوب کے لیے تمام امیدوں اور خوشیوں کو حوالہ کر دیا جاتا ہے۔ تو زندگی کا نصب العین خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے فرماتے ہیں ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

غالباً آزردہ ہی کے شعر سے متاثر ہو کر اصغر گونڈوی نے کہا ہے ؎

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائگاں ہے وہی رائگاں نہیں

عشق بغیر غم کے عنصر کے تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا۔ غم کی آنچ میں سلگنے سے شخصیت کے جوہر نکھرتے ہیں۔ اگر غم کی صلاحیت انسان میں نہ ہوتی تو انسان اشرف المخلوقات کے مرتبہ پر فائز نہ ہوتا۔

اگر ہم نہ تھے غم اٹھانے کے قابل
تو کیوں ہو نئے دنیا میں آنے کے قابل

جس طرح انسانی خواہشوں اور تمناؤں کی تازگی میں کبھی کمی نہیں آسکتی اسی طرح عشق و محبت کے لوازمات اور ان کی دلچسپیاں اور رنگینیاں انسانوں کو اپنی طرف مائل کرتی رہتی ہیں۔ محبوب کی ادا کس قدر دلکشی رکھتی ہے تو اس کے متعلق کہتے ہیں ؎

ناز و نگہہ، روش سبھی لاگو ہیں جان کے
ہے کون ادا وہ تیری کہ جو جانستاں نہیں

غالب بھی کہتے ہیں ؎

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

محبوب اگر غیروں سے تعلق رکھنے لگے تو گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ اس کے

بے مصلحت اور توجیہ بھی کرے تو اطمینان نہیں ہوتا۔ اسی لیے آزردہ کہتے ہیں ؎

ملنا ترا بہ غیر سے ہو بہر مصلحت
ہم کو تو سادگی سے تری یہ گماں نہیں

غالب نے یہی مضمون رشک کے ساتھ ذرا دوسرے رنگ میں کہا ہے ؎

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

محبوب کے کوچے میں جب قدم رکھ دیا تو پھر کسی کا احسان اٹھانا شیوۂ عشق کے خلاف ہے۔ آزردہ اس پر کتنا عمدہ مضمون پیدا کرتے ہیں ؎

نہ اٹھی بیٹھ کے خاک اپنی ترے کوچے میں
ہم نہ یاں دوش ہوا کے بھی کبھی بار ہوئے

غالب بھی کہتے ہیں ؎

دیوار بار منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

ان کے یہاں مضمون کسی قسم کا ہو طرز ادا کی معیاریت اور ثقاہت برقرار رہتی ہے۔ وہ شوخی کا اظہار بھی کرتے ہیں تو لیے دیے رہتے ہیں اس لیے کہتے ہیں ؎

ملنے سے اس کے گھٹتی ہے کیا تیری شان حسن
آزردہ خستہ جاں بھی ملے تو اگر ملے

انھیں ایسے ماحول میں رہنا پڑتا تھا جہاں ذرا سی لغزش یا بھی "غیر معتبر" بنانے کے لیے کافی تھی اس لیے کہتے ہیں ؎

اس شوخ سے مربوط بہت سہل سے ہوتے
گر ہم بھی سبک حرکت و نا اہل سے ہوتے

لیکن یہی بات جب غالب کہتے ہیں تو کھل جاتے ہیں ؎

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

حوادث زمانہ کے ہاتھوں انسان کو کیا کچھ پیش نہیں آتا۔ ان حوادث کے عکس اور ان واردات کے ردِ عمل سے انسان کے دل میں سینکڑوں قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ آزردہ کے یہاں ان جذبات کی عکاسی نہایت دلاویز طریقہ سے ملتی ہے۔

جمع طوفان دِ چشم تر مصرف — اب مصارف کا کچھ حساب نہیں

غالب بھی کہتے ہیں کہ میرے رونے کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ میں دریا کے حساب سے رونا چاہتا ہوں ؎

نہ کہہ کہ گریہ بمقدار حسرت دل ہے — مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

محبوب کے کوچہ میں قدم رکھتے ہی اچھے اچھوں کا بھرم کھل جاتا ہے ہر چند کوشش کی جاتی ہے عزت نفس برقرار رہے۔ لیکن جذبہ بے اختیار کے آگے سپر ڈال دینی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

دل نے ملا دیں خاک میں سب وضعداریاں
جوں جوں رکے وہ ملنے سے ہم بیشتر ملے

غالب کو کہنا پڑا ؎

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

عاشق دلگیر کی چاک گریبانی میں آشفتہ سری کی جو ایمائی کیفیتیں نہاں ہوتی ہیں اس کا اظہار کس خوبصورت انداز میں کرتے ہیں ؎

دامن اس کا تو بہت دور ہے اے دست جنوں
کیوں ہے بیکار گریباں تو مرا دور نہیں

غالب کا بھی شعر ہے ؎

چاک سینے کی جو تدبیر کرے ہے ناصح
کیا مرے ہاتھ کو سمجھا ہے گریبان سے دور

دامن اور گریبان کے تعلق سے آزردہ کے یہاں اور بھی اچھے اشعار ہیں ؎

آمد آمد ہوئی پھر موسم گل کی شاید
ان دنوں چاک کو پاتے ہیں گریبان سے انس
ناصح یہاں یہ فکر ہے سینہ بھی چاک ہو
ہے فکر بخیہ تجھ کو گریباں کے چاک میں
یہ ہاتھ اس کے دامن تلک پہنچے کب
رسائی جسے تا گریباں نہیں

دامن اور گریبان کے ساتھ "نقاب" کے لفظ سے بھی ایک خاص قسم کی ایمائی فضا تخلیق ہوتی ہے۔ خصوصاً اس لفظ سے معاملہ بندی اور واقعہ نگاری کی نزاکت بیان کی جاتی ہے۔ آزردہ کے کلام میں بھی اس کا استعمال دیکھیئے۔

یہ کہہ کے رخ نے ڈالیے ان کے حجاب میں
اچھے برے کا حال کھلے کیا نقاب میں

خورشید زار ہو وے زمیں دے جھٹک ذرا
سو آفتاب ہیں ترے گرد نقاب میں

یارب یہ کس نے چہرے سے الٹا نقاب جو
سو رخنے اب نکلنے لگے آفتاب میں

قسمت تو دیکھو کھولی گرہ کچھ تو رہ گئے
ناخن ہمارے ٹوٹ کے بند نقاب میں

نگاہ التفات ہو یا نگاہ تغافل عاشق کے لیے دونوں میں کشش ہے نگاہ میں لطف بھی ہے اور قہر بھی۔ ان میں جادو بھی ہے اور شفا بھی۔ محبوب کی مخمور نگاہوں کا تذکرہ جب بھی کیا جاتا ہے تو کیف و سرمستی کی لہر دوڑ جاتی

ہے۔ آزردہ کے یہاں مست نگاہوں کا ذکر بار بار ملتا ہے اور ہر بار ان میں ایک نیا لطف ہوتا ہے۔ کہتے ہیں اور کس مزے سے کہتے ہیں ؎

ہیں اور ذوقِ بادہ کشی؟ لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

محتسب کو کیا بیکار تری آنکھوں نے
ایک مے خانہ بھی اس دور میں معمور نہیں

تری آنکھوں کے دور میں کیا کیا
سحر رسوا نہیں، خراب نہیں

ہزار شیوہ ہیں پنہاں کہ جی ہی جانے ہے
تری نگہہ کا تغافل ہے اک جواب نہیں

آنکھوں سے دیکھ کر تجھے سب ماننا پڑا
کہتے تھے جو ہمیشہ حسیں ہے حیاں نہیں

پہلے آثار حیا بھی نہ گئے تھے اتنے
جیسے آنکھوں میں تری اب اثر خواب نہیں

محتسب آئے تو نقشہ تری آنکھوں کا دکھائے
منہ میں ٹپکاؤں دم غش مئے گلنار کی بوند

میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے متعلق ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں "کہ جب میاں صاحب شمائل ترمذی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپا کا بیان آتا تو آنکھ کی تعریف میں فرماتے: دیکھو مفتی صدر الدین خاں صاحب کہتے ہیں" اور مذکورہ بالا شعر پڑھتے۔ آنکھ کے ساتھ دندان کا ذکر بھی لطف سے خالی نہیں۔ آزردہ فرماتے ہیں ؎

عکس دنداں کا پڑے تیرے اگر پانی میں
آب ہو جائے خجالت سے گہر پانی میں

محبوب کے سراپا کا بیان بھی بڑے مزے سے کرتے ہیں ؎

نقشے تو بہت صانع قدرت نے بنائے
پر بن نہ سکا پھر دہن ایسا، کمر ایسی

بعض اوقات رنگ و بو جذباتی زندگی کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ ان دونوں کے ذریعے تحت الشعور کی یادیں برانگیختہ ہوتی ہیں جو تخیل کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ فرماتے ہیں

امید ہو ہیں اس کی ملے یوں صبا سے ہم — جس طرح بے خبر سے کوئی بے خبر ملے
مہکا ہوا ہے بیت حزن دیکھنا کوئی — آیا نسیم مصر کا ہو کارواں نہیں

محبوب کی یاد عجیب عجیب انداز سے جذبات کے جادو جگاتی ہے۔ ان یادوں میں جمالیاتی خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ یادیں ایک لطیف رشتہ ہوتی ہیں جو گزری ہوئی زندگی کو موجودہ زندگی سے مربوط کرتی ہیں۔

ہجوم میں ہو یا تنہائی میں عالم تصور میں محبوب کی قربت محسوس ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

آنکھ اٹھائی نہیں وہ سامنے سو بار ہوئے — ہجر میں ایسے فراشگر دیدار ہوئے

محبوب کی جدائی میں کیا کچھ نہیں گزرتی۔ جدائی کے دن ہوں یا جدائی کی راتیں دونوں پہاڑ ہو جاتی ہیں آزردہ کہتے ہیں ؎

کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شب فراق — شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

یہی بات مومن بھی کہتے ہیں ؎

دن بھی دراز، رات بھی کیوں ہے فراق یار میں — کاہے سے فرق آ گیا گردش روزگار میں

تغزل میں طنز و تعریض بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اردو کے ہر بڑے غزل گو شاعر کے یہاں طنز و تعریض سے کام لیا گیا ہے۔ طنز (طعنہ دینا) اور تعریض (کنایہ میں بات کہنا) کا مقصد کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو جلی کٹی سنا کر دل کا بخار نکالا جائے اور کبھی اشتعال دلا کر اپنی مطلب برآری ہوتی ہے۔ آزردہ کے شیوۂ گفتار میں طنز و تعریض نے بڑا حسن پیدا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

آزردہ مر کے کوچۂ جاناں میں رہ گئے — دی تھی دعا یہ کس نے کہ جنت میں گھر ملے
فلک نے بھی سیکھے ہیں تیرے سے طور — کہ اپنے کیے سے پشیماں نہیں
اسی کی سی کہنے لگے اہل حشر — کہیں پرسش دادخواہاں نہیں
منبذل میں ہی تو ہوں آپ جو کہیے سچ ہے — رات جھگڑے تو مجھی پر سر بازار ہوئے؟
کیا عقل محتسب کی کہ لایا ہے کھینچ کر — سوداز دوں کو محکمۂ احتساب میں

الجھنے کو بلا ہیں آپ بھی کچھ خیر ہے صاحب — لگایا ہاتھ کس نے آپ کی زلفِ پریشاں کو

صبح ے آئینہ اس بت کو دکھایا ہم نے — رات اغیار سے ملنے کے جو انکار ہوئے

کچھ بھی لگی نہ رکھی، ڈبودی رہی سہی — دل کو نہ ڈالنا تھا سوال و جواب میں

یہ عمر اور عشق ہے آزردہ جائے شرم — حضرت یہ باتیں پھبتی ہیں عہدِ شباب میں

پرزے پرزے نہ کر دنامہ مرا بعد دیکھے — یہ بھی چھاتی سے لپٹتا ہے کہ منظور نہیں

زاہدوں کا طبقہ حسن و عشق کے مزے سے نا آشنا اور مشاہدہ فطرت سے بیگانہ ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو اسی روپ میں ظاہر کرتا ہے جو اس کے باطنی کیفیات سے میل نہیں کھاتا۔ عبادت کی محض ظاہری رسوم کے ادا کر دینے سے عمل کی حقیقی تڑپ دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی بدنو نیتیاں اکثر ریاکاری کے دامن میں پناہ لیتی ہیں۔ اسی لیے آزردہ تعریض کرتے ہیں ؎

ہر ہر روئیں سے خرقہ کے بہرے ہے خوں چکاں
غوطے تو سو دیے اسے زمزم کے آب میں

اور اس ریاکاری کا پردہ اس طرح فاش کرتے ہیں ؎

اٹھنے میں صبح کے یہ کہاں سر گرانیاں — زاہد نے مے کا جلوہ یہ دیکھا ہے خواب میں

زندگی کے میدان میں جب کوئی مہم آتی ہے تو یہ اکثر پیچھے رہ جاتے ہیں اور جن کو ہم قابلِ التفات نہیں سمجھتے۔ ان سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام پا جاتے ہیں چنانچہ فرقہ زہاد پر ان کا یہ شعر تو ضرب المثل ہو گیا ہے ؎

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

عشق کی منزل بڑی دور دراز ہے۔ اس راہ میں سینکڑوں نئی نئی واردتیں اور مقامات پیش آتے ہیں، رنج و مسرت، جوش و ضبط۔ وصل و ہجر، شکر و شکایت صبر و بے قراری مستی و ہوشیاری ان سب مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ آزردہ اپنے تجربات و واردات کو دیکھیے کس طرح بیان کرتے ہیں ؎

جو کچھ نہ دیکھنا تھا سو وہ دیکھنا پڑا — اس بے وفا سے پہلے تجھے کیا دیکھ کر ملے

دیکھے ہنر جو اپنے ہی، وہ جانے اس کا کام — ہم کو تو عیب دیکھ کے اپنے ہنر ملے

پرواز دار رہنے دے ہمار پرواز مشغلہ تک، — جینے ہی کے لیے مجھے یہ بال و پر ملے

افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند — کس دن کھلا ہوا درِ پیر مغاں نہیں

مر کر بھی ہمارا دل بیتاب نہ ٹھہرا — کشتہ بھی ہوا تو بھی یہ سیماب نہ ٹھہرا

ترے مجروح کے سینے میں کچھ گرمی سی باقی تھی — وہیں بس ہو گیا ٹھنڈا جو کھینچا تیرے پیکاں کو

گو اسیری میں ہوں بہ مثل اسیر تصویر — نہ غم قید نہ پروائے رہائی مجھ کو

وہ شاخ نخل خشک ہوں میں کنج باغ میں — دیکھے ہے بھول کر بھی جسے باغباں نہیں

اچھا ہوا نکل گئی آہ حزیں کے ساتھ — اک قہر تھی، بلا تھی، قیامت تھی، جاں نہیں

شکوہ و شکایت کے انداز میں محبوب سے یہ چھیڑ چھاڑ دیکھیے ؎

اک بات پر بگڑ گئے جو عمر بھر ملے — اس سے طریق صلح کے کیا صلح گر ملے

باہم سلوک تھا یہ ترے دور حسن میں — یہ رسم اٹھ گئی کہ بشر سے بشر ملے

عالم خراب ہے نہ نکلنے سے آپ کے — نکلو تو دیکھو خاک میں کیا گھر کے گھر ملے

ذکر وفا وہ سنتے ہی مجلس سے اٹھ گئے — کچھ گفتگو بھی ٹھیک نہ تھی ایسے باب میں

اس مضمون کو مومن خاں بھی بیان کرتے ہیں اور اپنے مخصوص انداز میں ؎

تم اٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا — سائے سے مرے نفرت اے رشک پری اتنا

کہتے ہیں گرفتارِ محبت کے حق میں دشمن کی دعا بھی بے اثر ہو کر رہ گئی ہے ؎

کاش مقبول ہو دعائے عدو — کیا کروں وہ بھی مستجاب نہیں

مومن خاں کہتے ہیں ؎

یارب کوئی معشوقہ دلجو نہ ملے اب — جو ان کی دعا ہے وہی اپنی بھی دعا ہے

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانیوں پر کیا کچھ گزری اور آزردہ کو خود کن حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ بڑی دردناک داستان ہے۔ ناممکن ہے کہ آزردہ جیسے حساس شاعر ان سے متاثر نہ ہوتے۔ ان غم انگیز کیفیات کی جھلک

کہیں کہیں ان کے کلام میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بلند آشیانوں پہ بجلی گری — جو تنکے بچے تھے ڈوبے وہ سیلاب میں
وہ عریاں ہیں سرما میں تھی جن کی شب — گذرتی سمور اور سنجاب میں

گیا کون سا صید افگن ادھر سے — کہ خالی پڑے آشیانے بہت ہیں

خدایا یہ رنج اور یہ ناصبوری — نہ تھے ہم تو اس آزمانے کے قابل
رہے ہم نہ کچھ مصطفےٰ خاں کے غم میں — نہ فکر سخن، نے پڑھانے کے قابل
نہ چھوڑیں گے محبوبِ الٰہی کے در کو — نہیں گو ہم اس آستانے کے قابل
نہیں قید کرنے سے کیا نفع صیاد — نہ تھے دام ہی ہم تو لانے کے قابل
نہ بال منقش نہ پرہائے رنگیں — نہ آواز خوش کے سنانے کے قابل
ہوئے ہیں وہ ناقابلوں میں شمار اب — جنھیں مانتے تھے زمانے کے قابل
وہ آزردہ جو خوش بیاں تھے نہیں اب — اشارے سے بھی کچھ بتانے کے قابل

یہ تو ان کی غزل کے اشعار ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک "شہر آشوب" بھی لکھا ہے جس میں دلی کی بربادی بڑے دردانگیز طریقے سے بیان کی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

مجازی حسن و عشق کا سوز و گداز کبھی عشقِ حقیقی بن کر جلوہ گر ہوتا ہے تو مبدءِ حسن یعنی ذاتِ باری اور اس کے محبوب سے عقیدت کے جذبات ابل پڑتے ہیں۔ آزردہ تو بہرحال ایک مذہبی شخصیت تھے۔ ان کی غزلوں میں کہیں کہیں رسول اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کا ذکر خیر بے اختیارانہ طور پر آگیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

مہر جہاں فروز دکھا دوں جبیں کو میں — گر سنگ آستانۂ خیر البشرؐ ملے

میں ہوں اور گوشۂ یثرب یہ تمنا ہے اب — تو ہوس سلطنتِ قیصر و فغفور نہیں
کون سا دن ہے کہ خورشید جہاں تاب سحر — خاکِ در سے ترے دریوزہ گر نور نہیں
مار ڈالے پر تو لطفِ نبوی کوئی عمل — شمع تنہائی ظلمت کدۂ گور نہیں

پایۂ عرش بڑھانا تھا وگر نہ یہ نام — لوح بر عرش کی ہوتا کبھی مسطور نہیں

فارسی کلام : مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں ہندوستان کے اندر فارسی کے چمنستان شعر میں ویسے ہی بہار آگئی تھی جیسی کہ عہد شاہجہانی اور عہد جہانگیری میں تھی۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب، حکیم مومن خاں مومن، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، حسرتی، عبداللہ خاں علوی، امام بخش صہبائی اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ اس عہد میں نہ صرف فارسی ادب کا نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے بلکہ اعلیٰ درجہ کے سخنور بھی تھے۔ آزردہ فارسی زباندانی میں کس درجہ کے شناور تھے اس کے متعلق صہبائی جیسے نکتہ سنج اور نکتہ شناس کہتے ہیں۔

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی

بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید

اس دور کے لوگوں میں شیفتہ کا مذاق شعر و سخن بڑا مستند اور معیاری سمجھا جاتا تھا۔ وہ بھی جہاں آزردہ کے فضل و کمال کا "گلشن بے خار" میں تذکرہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔

" خیاط ازل نے قابلیت کی قبا اس خوبی سے ان کی زیب تن کی ہے اور روشن گر قضا و قدر نے اس روشن دلی اور آگاہی سے ان کا ضمیر منور کیا ہے کہ ایسی فضیلت والا کوئی شاعر ایران سے نہیں ہوا "

ممکن ہے شیفتہ کی رائے میں مبالغہ ہو اور اس میں کچھ دوستی کا پاس و لحاظ بھی ہو، لیکن جہاں تک آزردہ کی فارسی شاعری کا تعلق ہے۔ وہ ضرور شعرائے ایران کے مقابل میں رکھی جا سکتی ہے۔ بدقسمتی سے ان کے فارسی کلام کا بڑا ذخیرہ ضائع ہو گیا۔ لے دیکر چند متفرق اشعار اور تین غزلیں دستیاب ہوتی ہیں اور خزاں کی تاراجی سے ان کے گلشن سخن کے چند پھول ہی بچ گئے۔ لیکن صرف انھیں دیکھ کر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں کتنا حسن اور دلکشی رہی ہوگی۔ ان کا مجموعہ کلام

بھی محفوظ رہا ہوتا تو وہ بھی غالب کی طرح کہہ دیتے: "فارسی میں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ" پھر بھی نواب صدیق حسین خاں نے "شمع انجمن" میں، اور سرسید احمد خاں نے "آثار الصنادید" میں جو کلام بھی نقل کر دیا ہے۔ ان کے لب و لہجے میں زبان کی صفائی، خیال کی نزاکت، صفائی، روانی اور سوز و گداز کی خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ صرف اتنے سے مختصر سرمایہ کے اندر بھی ارباب ذوق کے لیے لطف کا کافی سامان ہے۔ اور انھیں دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اگر پورا کلام رہا ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ اس میں عرفی کا زور کلام بھی ہے اور نظیری کا علوے تخیل بھی طالب آملی کی ندرت فکر بھی ہے اور ابو طالب کلیم کی معنی آفرینی بھی۔ وحشی یزدی کی معاملہ بندی بھی ہے اور حافظ کی شوخی بھی۔ بہر حال ان کے دستیاب کلام میں بھی معاملہ بندی کے ساتھ وہی سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ جو کہ دشت بیاضی کی نمایاں خوبی شمار ہوتی ہے۔ زبان بھی دلسپی ہی ہے۔ اور درد بھی ویسا ہی۔

چند متفرق اشعار مع ترجمہ دیے جاتے ہیں جن سے ان کے محاسن شعری اور خصوصیات دیکھے جا سکتے ہیں ؎

آزردہ زمن حال شب وصل چہ پرسی

(۱) نے دل خبرم داشت نہ از دل خبرم بود

(آزردہ شب وصل کا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو اس وقت تو عجیب حیرت و مدہوشی کا عالم تھا۔ نہ تو دل کو میرا ہوش رہ گیا تھا اور نہ مجھے دل کی کچھ خبر تھی)

تو خود انصاف کن اے آشنا دشمن روا باشد

(۲) مرا درد تو در پہلو۔ ترا بیگانہ در پہلو

(اے دوست ذرا تو خود ہی انصاف کر کہ میں تو تیرے درد میں بے قرار ہوں اور تو غیر کے پہلو میں بیٹھا ہو)

بایں تقویٰ درون میکدہ آزردہ را دیدم

(۳) صراحی در بغل، ساغر بکف، پیمانہ در پہلو

(اس تقویٰ اور پرہیزگاری کے دعویٰ کے ساتھ آزردہ کو میں نے دیکھا کہ میخانے میں براجمان ہیں. صراحی ان کے آس پاس ہے ۔ پیالہ ہاتھ میں ہے ۔ اور پیمانہ پہلو میں ہے)

عالمے کشتہ شد و چشم تو در ناز ہماں

(۴) صد قیامت شد و حسن تو در آغاز ہماں

(ایک عالم تو تیری نگاہوں سے موت کے گھاٹ اتر گیا اور تیری نگاہیں ہیں کہ ان کا ناز ختم نہیں ہوا ۔ یہاں سینکڑوں قیامتیں گزر گئیں اور حال یہ ہے کہ ابھی تیرے جلوہ حسن کا آغاز ہی ہے ۔)

صحبتے بود عجب دوش میانِ من و یار

(۵) صد شکایت بہ لب و رخصت اظہار نبود

(کل میرے اور معشوق کے درمیان عجیب یکجائی تھی ۔ ہونٹوں پر شکایتیں تو سینکڑوں تھیں لیکن ان کے اظہار کا یارا نہ تھا)

کو عشق تا بہ پیشکش آریم گنج علم

(۶) آساں دہیم آنچہ بمشکل گرفتہ ایم

(عشق کہاں ہے تاکہ اس کی بارگاہ میں ہم علم کا خزانہ نذر کر دیں ۔ ہم نے اگرچہ اسے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا ہے ۔ لیکن ہم آسانی سے اس کی خدمت میں پیش کر دیں گے ۔

زاہد بیاد موت شہیدان عشق بیں

(۷) کیں موت را نہ زندگی جاوداں رسد

(زاہد موت کی یاد ہی کرنی ہے تو شہیدانِ عشق کی موت کو یاد کرو کہ انھوں نے موت کو وہ رتبہ بخشا کہ اسے حیات جاودانی بھی نہیں پا سکتی)

طوبیٰ لک از ملائک رحمت خوزد بگوش

(۸) ہر دم ندائے ارجعی از آسماں رسد

(ذرا کان لگا کر سنو تمھیں رحمت کے فرشتوں کی طرف سے خوشخبری دی جارہی ہے. آسمان سے پیہم صدائے ارجعی (واپس ہو جاؤ) کی آواز آرہی ہے۔)

در باغ جور تازہ کہ از باغباں رسد

(۹) اول بہ بلبلان کہن آشیاں رسد

(باغ میں جب باغبان کسی نئے ظلم کی ابتدا کرتا ہے تو پہلے اس کے پرانے باشندے بلبلوں ہی کے آشیانوں پر ستم ڈھاتا ہے)

ہر نگہہ کاں بت ترسا بچہ در کار م کرد

(۱۰) آتشے بود کہ زد خرمن ایمانم سوخت

(اس بت کافر کی ہر نگاہ مجھ پر ایسا کام کر رہی تھی گویا ایک آگ تھی جس نے میرا خرمن ایمان جلا کر رکھ دیا۔)

اب ذیل میں آزردہ کی تینوں مکمل غزلیں ہدیۂ ناظرین ہیں فارسی زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ان میں حسن خیال، حسن الفاظ اور حسن ادا کا مکمل سامان مل جائے گا.

(۱)

آتش عشق فلک در دل و در جانم سوخت
زانکہ از داغ دگر دید کہ نتوانم سوخت

دل ز خون ناب جگر سوخت و مژگانم سوخت
آخر ایں شعلہ بہ پیدا ایم و پنہانم سوخت

پنبۂ مرہم او بہر قیامت باشد
عشق آں داغ کہ در سینہ سوزانم سوخت

روز ہجراں تو می سوخت مرا حسرت وصل
در شب وصل تو اندیشہ ہجرانم سوخت

ہیچ گہ چرخ جفا پیشہ نمی ساخت بمن
شکر ایزد کہ ز آہ شرر افشانم سوخت

زحمت از بہر عذابم مکش اے نار جحیم
کہ سراپائے مرا خجلت عصیانم سوخت

شرر دوزخ جاں تاب بسی بود بلند
چوں مقابل شدہ با سینہ سوزانم سوخت

برگ و جمعیت دیوان جزا برہم خورد
جنت از حسن تو و دوزخ از افغانم سوخت

باز آں بستر خارست و ہماں بالش سنگ
سر شوریدۂ من زانوئے یارانم سوخت

بزم افروز شبستاں نشدم آں شمعم
بخت خوابیدہ سر خاک شہیدانم سوخت

دل پر درد بخوں ناب جگر سوخت مرا
آں کہ یک عمر بہ او ساختہ ام آنم سوخت

ہر نگہ کاں بت ترسا بچہ در کارم کرد
آتشے بود کہ زد خرمن ایمانم سوخت

کو نسیمے کہ ز شرب دزد و سبز کند
خاست از ہند سمومے کہ گلستانم سوخت

گر ز آتش سخنے ہیچ کمالم نفزود
لیکن آزردہ از و جان حسودانم سوخت

---

(۲)

حسن کے راہزن کافر و دیندار نبود
آفت سبحہ بلائے بت و زنار نبود

یاد روزیکہ خبر از ہیچ پدیدار نبود
پردۂ دید مرا مانع دیدار نبود

ہر درے بر رخم از روضۂ رضواں وا بود
خواہش بوئے گل از رخنۂ دیوار نبود

ایں شر و شور نہ در صحبت رنداں بودہ
جملہ بد مست و مے حوصلہ بردار نبود

بود از گردش چشم تو گلستاں دل ما
در میاں واسطۂ ثابت و سیار نبود

رب ارنی ز لب مستی من سر ریزد
لن ترانی ادب آموز طلبگار نبود

مست در گوشۂ میخانۂ وحدت بودیم
کار تا بادہ کشی بود دگر کار نبود

عشق بے پردہ تماشائے جمالش می کرد
ہیچ بیخود ز مئے وعدۂ دیدار نبود

بود سر رشتۂ کارم بسر زلف سیاہ
قصۂ کشمکش سبحہ و زنار نبود

شکر اللہ چو بطوف حرم آوردند
روئے دل جز طرف خانۂ خمار نبود

دست تا بند نقابش برساندم مردم
سعی خوش بود مگر بخت مددگار نبود

صحبتے بود عجب دوش میان من و یار
صد شکایت بلب در خصت اظہار نبود

دل خوں گشتۂ ما درد کرد دگر نہ صد بحر
خرج یکروزۂ ایں چشم تلف کار نبود

گر دغم جز دل ناشاد محلے نگزید
ورنه آئینه ما قابل زنگار نبود

سهل و آسان شد امروز بعهد تو چنیں
ورنه دشوار تر از ترک وفا کار نبود

از کساد هنر است اینکه بهیچم نخرند
جنس تا بود گراں ناز خریدار نبود

لطف ساقی نگر۔ دور بمن آخر گرد
چوں مرا حوصلهٔ ساغر سرشار نبود

در دلم آن مژه صد خنجر الماس شکست
زهر چشم تو بآن گرچه مددگار نبوذ

از علاج دل بیمار چرا دست کشید
گر مسیحا بتمنائے تو بیمار نبود

طرز آتش سخنی طبع من ایجاد نبود
پیش ازیں ایں روش و شیوهٔ اشعار نبود

آه از خجلت آزرده بیانار جزا
هیچش از جنس گراں مرتبه دربا نبود

---

(۳)

خواهم دم دعا بدعا تا گریستن
شد لیک بے اثر بدعا ها گریستن

سوز دلم نمود دو بالا گریستن
ایں درد را نگشته مداوا گریستن

دل قطره قطره خوں شده از چشم بر چکید
تاراج داد مشغلهٔ ما گریستن

پیشش بضبط گریه بکوشم ز رشک غیر
بر رحم تا نیاورد او را گریستن

جز چوں تو سنگ دل نتواند شد از دگر
نگریستن بحال من و نا گریستن

از اشک ریزی مژه خالی نشد دلم
خواهم چو زخم از همه اجزا گریستن

بے عندلیب خوش نبود ناله در چمن
خواهیم در خزاں به تمنا گریستن

واعظ اگر بیاد قدے گریه نارواست
بازار چه روست از پی طوبی گریستن

شوید ز دیده لذت خوابی که دیده بود
بیشتن ازاں گرفت زلیخا گریستن

اے چشم دجله ریز ادب را نگاه دار
ایں ست در مدینه و بطحا گریستن

رسوا شدن چو برق بود یا بچشم نم
اے ابر با گریستن ما گریستن

ابر آب شد ز گریه ام و برق خنده زن
آہے کجا که جمع کنم با گریستن

از سوز سینه خوف ندارم که کار ماست
از کاوِ کاوِ آن مژه دریا گریستن

آوردش برحم لطرزی مگر نسیم | خوش صرفہ بود از لب گویا گریستن
طوفانِ نوح بود حدیثے شنیدہ | چشم ترم نمود زرسوا گریستن
در عیش بے قرارم و در غم بہ پیچ و تاب | خندید نم شبیہ بود با گریستن
دل را ہمیشہ خندہ من خوں کند چو گل | بنگا مذم جگر قلم آسا گریستن
موجے بزن کہ تر کنم ابر بہار را | اے دیدہ تا کجا بہ مدارا گریستن
اے دل غمیں مباش بالعزت کہ شمع دار | با خندہ ہم عناں بود اینجا گریستن
یا رب نگاہ بوالہوسم دہ کہ شد مرا | در بزم اور حجاب تماشا گریستن
سیراب تا زمین غزل کرد گر بیام | بینم کہ می رسد بکجا ہا گریستن
اے دل بیا کہ خاک کنم ابر و برق را | از تو بخون تپیدن و از ما گریستن
اشعار نرد رہی غزل آمد کہ ربط داشت | چوں چشم من قوافی آن با گریستن

آزردہ خیز کامدہ عرفی و طالبا
از تو قصیدہ خواندن و زینہا گریستن

عربی اشعار

وکنا لغصنی بانۃٍ قد تالفا
علی دوحۃٍ حتی استطالا وا ینعا

(ہماری مثال ان دو شاخوں کی سی تھی جو ایک درخت پر لپٹ گئی اور بار برگ دبار ہو گئی ہوں)

یغنیہما مدح الحمام مرجعا
(۲) ولسیقیہما ماسن السحاب مترعا

(جنھیں کبوتر نے پیارے نغموں سے خوش کیا ہو اور سحاب نے چھلکتے ہوئے پیالوں سے مسرور بنایا ہو)

سلیمین من خطب الزمان اذا سطا

(۳) خلیلین من قول الحسود اذا سعا

(نہ دستبردِ زمانہ کا ڈر تھا ۔ نہ حاسدوں کی چغل خوری کا غم)

فغادرنی من غیر ذنب جنیتہ

(۴) والقی لقلبی حرقۃ و توجعا

(اسی حالت میں بلا کسی قصور کے وہ مجھ سے جدا ہو گیا اور مجھے درد و سوزش میں چھوڑ گیا)

عفا اللہ عنہ ما جناہ فاننی

حفظت لہ العہد القدیم وضیعا

(خدا اس کے گناہ کو معاف کرے ۔ میں تو اپنے عہد پر قایم ہوں ۔)

(آثار الصنادید)

باب ۱۳

سرمایۂ کلام اردو

آرزدہ کا کوئی مجموعۂ کلام مرتب صورت میں نہیں ملتا۔ اردو شعراء کے تذکروں میں بعض نے ان کے اردو کلام کا انتخاب دیا ہے۔ کسی نے پوری غزل دی ہے اور کسی نے متفرق اشعار۔ میں نے ان تمام اشعار کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کلام کی جستجو کے دوران پتہ چلا کہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے "اردو نامہ" کراچی ماہ اپریل ۱۹۶۲ء میں آرزدہ کے اشعار فراہم کیے ہیں چنانچہ ان کے جمع کردہ مواد سے میری معلومات میں مزید اضافہ ہوا۔ انھوں نے ہر شعر کے بارے میں یہ بھی تشریح دی ہے کہ کس میں کتنے اشعار ہیں اور کتنے نہیں۔ بعض جگہ الفاظ کا اختلاف بھی نقل کر دیا ہے۔ بہر حال جہاں تک دسترس ہو سکی آرزدہ کے دستیاب اشعار دیے جاتے ہیں۔ امید ہے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

غزل

اگر ہم نہ تھے غم اٹھانے کے قابل
تو کیوں ہوتے دنیا میں آنے کے قابل

کروں چاک سینہ تو سو بار لیکن
نہیں داغ دل یہ دکھلانے کے قابل

ملیں تم سے کیونکر رہے ہی نہیں ہم
بلانے کے قابل نہ آنے کے قابل

چھٹے بھی قفس سے تو کس کام کے ہیں
نہیں جب چمن تک بھی جانے کے قابل

بجز اس کے تھے خاک پہلے بھی اے چرخ
نہ تھے خاک میں پھر ملانے کے قابل

کیا ترک دنیا میں جب تو یہ سمجھے
کہ دنیا نہیں دل لگانے کے قابل

وہ آئے دم نزع کیا کہہ سکیں
نہیں ہونٹ تک بھی ہلانے کے قابل

خدایا یہ رنج اور یہ ناصبوری
نہ تھے ہم تو اس آزمانے کے قابل
رہے ہم نہ کچھ مصطفےٰ خاں کے غم میں
نہ فکر سخن نے بڑھانے کے قابل
نہ چھوڑیں گے محبوب الٰہی کے در کو
نہیں گو ہم اس آستانے کے قابل
ہمیں قید کرنے سے کیا نفع صیاد
نہ تھے دام میں ہم تو لانے کے قابل
نہ بال منقش نہ پر ہائے رنگیں
نہ آواز خوش کے سنانے کے قابل
ہوئے ہیں وہ ناقابلوں میں شمار اب
جنھیں مانتے تھے زمانے کے قابل
وہ آزردہ جو خوش بیاں تھے نہیں اب
اشارے سے بھی کچھ بتانے کے قابل

ظہور علی ظہور دہلوی نے آزردہ کی اس غزل کو تضمین کیا تھا۔ جو ان کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے قاضی عبدالودود صاحب نے یہ غزل نقوش (جون ۱۹۵۶ء) میں نقل کی تھی۔ تیرھواں شعر اس میں نہیں ہے۔

غزل (۲)

نکلنا ہوا دل سے دشوار کیوں
یہ اک آہ ہے اس کا پیکاں نہیں
یہ ہاتھ اس کے دامن تلک پہنچے کب
رسائی جسے تا گریباں نہیں
فلک نے بھی سیکھے ہیں تیرے سے طور
کہ اپنے کیے سے پشیماں نہیں
مرا نامہ شوق تلوؤں تلے
نہ ملیئے یہ خون شہیداں نہیں
اسی کی سی کہنے لگے اہل حشر
کہیں پرسش داد خواہاں نہیں
(خمخانہ جاوید)

غزل (۳)

نالوں سے میرے کب تہہ و بالا جہاں نہیں
کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں

قاتل کی چشم تر نہ ہو یہ ضبط آہ دیکھ
جوں شمع سر کٹے پہ اٹھایاں دھواں نہیں

اے بلبلان شعلہ دم اک نالہ اور بھی
گم کردہ راہ باغ ہوں یاد آشیاں نہیں

اس بزم میں نہیں کوئی آگاہ ورنہ کب
واں خندہ زیر لب ادھر اشک نہاں نہیں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

ناز و نگہہ، روش سبھی لاگو ہیں جان کے
ہے کون ادا وہ تیری کہ جو جانستاں نہیں

ملنا ترا بہ غیر سے ہو بہر مصلحت
ہم کو تو سادگی سے تری بدگماں نہیں

آزردہ تک بھی کچھ نہ چلے اس کے روبرو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

(خمخانۂ جاوید و واقعات دار الحکومت)

غزل (۴)

شب جوش گریہ تھا مجھے یاد شراب میں
تھا غرق میں تصور آتش سے آب میں

یارب وہ خواب حق میں مرے خواب مرگ ہو
آدے وہ مست خواب اگر میرے خواب میں

یارب یہ کس نے چہرے سے الٹا نقاب جو
سو رخنے اب نکلنے لگے آفتاب میں

کیا عقل محتسب کی کہ لایا ہے کھینچ کر
سودا زدوں کو محکمۂ احتساب میں

ہم جان و دل کو دے چکے موہوم امید پر
اب ہو سو ہو ڈبو دے یہ کشتی شراب میں

کچھ بھی لگی نہ رکھی ڈبو دی رہی سہی
دل کو نہ ڈالتا تھا سوال و جواب میں

الفت میں اون کی، اب تو ہے جانوں کی پڑ رہی
دل کس شمار میں ہے، جگر کس حساب میں

تھے جستجو میں روز ازل جائے درد کی
آیا پسند دل مرا اس انتخاب میں

(آثار الصنادید، طبقات شعرائے اردو)

غزل (۵)

یہ کہہ کے رکھنے ڈالیے ان کے حجاب میں
اچھے برے کا حال کھلے کیا نقاب میں

خورشید زار ہووے، زمیں دے جھٹک ذرا
سو آفتاب ہیں ترے گرد نقاب میں

بے اعتدالیاں مری ظرف تنگ سے ہیں
کفا نقص کچھ نہ جوہر صہبائے ناب میں

اٹھتے ہیں صبح کے یہ کہاں سرگرانیاں
زاہد نے مے کا جلوہ یہ دیکھا ہے خواب میں

تحقیق ہو تو جانوں کہ میں کیا ہوں، قیس کیا
لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں

ہیں اور ذوق بادہ کشی : لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

امداد چشم کیا ہو لگی دل کو آگ جب
جلنے کے بعد خوں نہیں رہتا کباب میں

ہیں دونوں مثل شیشہ یہ سامانِ صد شکست
جیسا ہے میرے دل میں نہیں ہے حباب میں

افکار فکر سے نہ ہوا کچھ کبھی انکشاف
جتنا بڑھے ہم اور بڑھی جا حجاب میں

یہ عمر اور عشق ہے آزردہ جائے شرم
حضرت یہ باتیں بھبتی ہیں عہد شباب میں

(آثار الصنادید - خمخانۂ جاوید)

غزل (۶)

حسن کی شان سے ہے پر رہے مستور نہیں
ورنہ ہوتا کبھی یوں جلوہ سر طور نہیں

لاکھ ہنگامۂ منصور دکھا دیں دم میں
پر ہم افشائے سرائر میں ہیں مامور نہیں

چارہ اب کیا ہو جو ہو نشتر و مرہم یکساں
کونسا داغ ہے سینے میں جو ناسور نہیں

پرزے پرزے نہ کرو نامہ مرا ان دیکھے
یہ کبھی چھاتی سے لپٹا ہے کہ منظور نہیں

ریختہ یہ ہے کہ جوں آیت محکم ہے صاف
معنی دور نہیں، لفظ کبھی مہجور نہیں

آستاں ہے ترے در کا وہ تجلی پرتو
پہنچے پا سنگ کو بھی جس کے جبل طور نہیں

عذر کرتے ہی بنی ان کو تجھے جب دیکھا
جو کہا کرتے تھے رسوا ترا معذور نہیں

خانۂ غیر تجلی کدہ ہو، اور نصیب
ہم کو جز روز سیاہ شب دیجور نہیں

دل پر رخنہ ہی کو آگ لگا دی ہم نے
چارہ جز شعلہ پئے خانۂ زنبور نہیں

ہے بنا قاعدہ یاں ذبح کا قاتل کی طرف
دیکھنا پھر کے کنکھیوں سے بھی دستور نہیں

ہیں ہوں اور گوشۂ یثرب، یہ تمنا ہے اب
خواہش سلطنت قیصر و فغفور نہیں

کونسا دن ہے کہ خورشید جہانتاب سحر
خاک در سے ترے دریوزہ گر نور نہیں

ہیں تو ہم جنس فراہم نہ ہو سامان طرب
بزم ماتم ہی سہی گو انجمن سور نہیں

مژدہ اے چرخ کہ اب میری طرح ہے گھٹتا
طاقت اوٹھنے کی ذرا نالۂ رنجور نہیں

محتسب کو کیا بیکار تری آنکھوں نے
ایک میخانہ بھی اس دور میں معمور نہیں

دامن اوس کا تو بھلا دور ہے اے دست جنوں
کیوں ہے بیکار گریباں تو مرا دور نہیں

مدد اے پرتو لطف نبوی کوئی عمل
شمع تنہائی ظلمت کدۂ گور نہیں

پایۂ عرش بڑھانا تھا وگرنہ یہ نام
لوح پر عرش کی ہوتا کبھی مسطور نہیں

ہوں ادا نظم میں کس طرح مناقب تیرے
سلسلہ یہ متناہی ہے وہ محصور نہیں

ترک روئے خوش۔ آزردہ محالات سے ہے
یوں خدائی تو خدائی سے ہے کچھ دور نہیں

(آثار الصنادید)

غزل (۷)

بلا ساقیا مئے خنک آب میں
کہ ٹھنڈی نہیں توبہ مہتاب میں

گیا دین کیا، حضور نماز
وہ یاد آئے ابرو جو محراب میں

ملے کچھ تو زخم جگر کا مزہ
بجھا کر رکھا تیغ زہراب میں

الٰہی فلک جس سے پھٹ جائے دے
وہ تاثیر آہ جگر تاب میں

بلند آشیانوں پہ بجلی گری
جو نیچے تھے ڈوبے وہ سیلاب میں

وہ عریاں ہیں سرما میں تھی جنکی شب　　گزرتی سمور اور سنجاب میں

نہ آئے ہوں آزردہ لینا خبر
پڑی دھوم یہ سارے پنجاب میں

(خمخانۂ جاوید)

غزل (۸)

کیا حیا تو جا اثر ہے دم شعلہ تاب میں　　پردہ ہے برق آگ لگا دے نقاب میں

حال اس نگہ کا اس کے سراپا میں کیا کہوں　　مور ضعیف پھنس گئی جا شہد ناب میں

ذکر وفا وہ سنتے ہی مجلس سے اٹھ گئے　　کچھ گفتگو ہی ٹھیک نہ تھی ایسے باب میں

کیا پوچھتے ہو چارۂ از خویش رفتگاں　　سو جا سے چاک جامہ ہے سوزن خلاب میں

آواز صور تیرے شہید دل کو روز حشر　　لگتی تھی اک بھنک سی کانوں کو خواب میں

جو دیکھتے ہی اوس سے یہ گزرا کبھو نہیں　　یعقوب کے خیال و زلیخا کے خواب میں

ہر ہر روئیں سے خرقہ کے میرے ہے خونچکاں　　غوطے تو سو دیے اسے زمزم کے آب میں

اس چشم اشک بار کے کیونکر ہو سامنے　　رونے کا مادہ ہی نہیں ہے سحاب میں

قسمت تو دیکھ کھولی گرہ کچھ تو رہ گئے　　ناخن ہمارے ٹوٹ کے بند نقاب میں

ہر وقت آرزوئے عذاب جحیم ہے　　ہاتھوں سے ہجر کے ہوں میں کیا کیا عذاب میں

(آثار الصنادید)

غزل (۹)

کاش مقبول ہو دعائے عدو　　کیا کروں وہ بھی مستجاب نہیں

اب تو اس چشم تر کا چرچا ہے — ذکر دریا نہیں، سحاب نہیں

جمع طوفان و چشم تر مصروف — اب مصارف کا کچھ حساب نہیں

دھو دیا سب کو دیدۂ تر نے — وہ نہیں درس وہ کتاب نہیں

عشق بازی کا منہ چڑاتا ہے — اور وہ موسم نہیں شباب نہیں؟

تیری آنکھوں کے دور میں کیا کیا — سحر رسوا نہیں، خراب نہیں

مختصر حال چشم و دل یہ ہے — اس کو آرام، اس کو خواب نہیں

جو سراپائے یار آزردہ
تیرے دیواں کا انتخاب نہیں

غزل (۱۰)

مجھ سا بھی کوئی عشق میں ہے بدگماں نہیں — کیا رشک دیکھکر مجھے رنگ خزاں نہیں

آنکھوں سے دیکھ کر تجھے سب ماننا پڑا — کہتے تھے جو ہمیشہ چنیں ہے چناں نہیں

اوٹھ کر سحر کو سجدۂ مستانہ کے سوا — طاعت قبول خاطر پیر مغاں نہیں

افسردہ دل نہ ہو۔ در رحمت نہیں ہے بند — کس دن کھلا ہوا در پیر مغاں نہیں

اے جذبِ شوق رحم کہ مد نظر ہے یار — جا سکتی واں تلک نگہ ناتواں نہیں

شب اوس کو حال دل نے جتایا کچھ اس طرح — ہیں لب تو کیا نگہ بھی ہوئی ترجماں نہیں

کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شب فراق — شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

اچھا ہوئی نکل گئی آہ حزیں کے ساتھ — اک قہر تھی، بلا تھی، قیامت تھی جاں نہیں

جانے ہے دل خدا کہ مری سخت جانیاں — ان ناتوانیوں کو پہنچتی تواں نہیں

کہتا ہوں اوس سے کچھ میں نکلتا ہے منہ سے کچھ — کہنے کو یوں تو ہے گی زباں اور زباں نہیں

دہکا ہوا ہے بیت حزن دیکھتا کوئی — آیا نسیم مصر کا ہو کارواں نہیں

لب بند ہوں تو روزن سینہ کو کیا کروں — تھمتا تو مجھ سے نالۂ آتش عناں نہیں

کیا کچھ نہ گرد کھاؤں پر اک دن کے واسطے
ملتا بھی ہم کو منصب ہفت آسماں نہیں

وہ شاخ نخل خشک ہوں میں کنج باغ میں
دیکھے ہے بھول کر بھی جسے باغباں نہیں

بے وقت آئے دیر میں کیا شور شیں کریں
ہم پیرو پیر میکدہ بھی نوجواں نہیں

آزردہ نے پڑھی غزل اک میکدہ میں کل
وہ صاف تر کہ سینۂ پیر مغاں نہیں

(آثار الصنادید وغمخانۂ جاوید)

غزل (۱۱)

اک بات پر بگڑ گئے، نہ جو عمر بھر ملے
اوس سے طریق صلح کے کیا صلح گر ملے

باہم سلوک تھا، پہ ترے دور حسن میں
یہ رسم اٹھ گئی کہ بشر سے بشر ملے

دل محو چشم یار تھا، بیمار ہو گیا
کچھ ان پرستشوں کا بھی آخر ثمر ملے

اے نالہ تو نہ ساتھ دیا آہ کا تو کیا
امید کیا اثر کی جو دو بے اثر ملے

صدمہ جگر پہ پہنچے تو ہو دل میں کیوں نہ درد
کیا فرق کچھ جدا نہیں، ہیں دل جگر ملے

ہم کو ہمارے طالع بد نے ڈبو دیا
اچھے تھے گر نصیب تو کیوں چشم تر ملے

دھوؤں صد آب تیغ سے اے بے خبر جو کچھ
دامن سے تیرے دامن داغ جگر ملے

امید بو میں اس کی ملے یوں صبا سے ہم
جس طرح بے خبر سے کوئی بے خبر ملے

جو کچھ نہ دیکھنا تھا، سو وہ دیکھنا پڑا
اس بیوفا سے پہلے تھے کیا دیکھکر ملے

دیکھے ہنر جو اپنے ہی، وہ جانے اس کا کام
ہم کو تو عیب دیکھ کے اپنے ہنر ملے

مہر جہاں فروز دکھادوں جبیں کو میں
گر سنگ آستانۂ خیر البشر ملے

ملنے سے اس کے گھٹتی ہے کیا تیری شان حسن
آزردہ خستہ جاں بھی ملے تو اگر ملے

(قران السعدین جلد ۳ عدد ۱۲ ۔ ۲۷ مارچ ۱۸۴۸ء)

غزل (۱۲)

ہے مفت دل کی قیمت اگر اک نظر ملے
یہ وہ متاع ہے کہ نہ لیں مفت اگر ملے

انصاف کر کہ لاؤں میں پھر کون سا وہ دل
محشر کے روز بھی نہ جو داد جگر ملے

پروانہ وار ہے حد پرواز شعلہ تک
جلنے ہی کے لیے مجھے یہ بال و پر ملے

آنے سے خط کے جاتے رہے وہ بگاڑ سب
بن آئی اب تو حضرت دل تو خضر ملے

کیا شکر کا مقام ہے مرنے کی جائے دل
کچھ مضطرب ہے آج وہ بیرون در ملے

عالم خراب ہے نہ نکلنے سے آپ کے
نکلو تو دیکھو خاک میں کیا گھر کے گھر ملے

ہے شام ہجر آج او ظالم او فلک
گردش وہ کر کہ شام سے آکر سحر ملے

گو پاس ہو پہ چین تو ہے اس بگاڑ میں
کیا لطف تھا لڑے وہ ادھر اور ادھر ملے

دل نے ملا دیں خاک میں سب عنفدایاں
جوں جوں رکے وہ ملنے سے ہم بیشتر ملے

ٹوٹے یہ بخیہ زخم کا، ہمدم کہیں سے لا
خنجر ملے، کٹار ملے، نیشتر ملے

تھا اصل میں مراد ڈبونا جہان کا
قابل سمجھ کے گو یہ ہمیں چشم تر ملے

انکی گلی میں لے گئے آزردہ کر اسے
دی تھی دعا یہ کس نے کہ جنت میں گھر ملے
(قرآن السعدین)

پہلا ش، پہلا مصرعہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے والد ماجد کی روایت سے "آزردہ مر کے کوچۂ جاناں میں رہ گئے" نقل کیا ہے۔

غزل (۱۳)

آنکھ اٹھائی نہیں وہ سامنے سو بار ہوئے
ہجر میں ایسے فرامشگر دیدار ہوئے

کامل اس فرقۂ زہاد میں اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

نہ اٹھی بیٹھ کے خاک اپنی ترے کوچے میں — ہم نہ یاں دوشِ ہوا کے کبھی کبھی بار ہوئے

صبح لے آئینہ اس بت کو دکھایا ہم نے — رات اغیار سے ملنے کے جو انکار ہوئے

کچھ تعجب نہیں گر اب کے فلک ٹوٹ پڑے — آج نالے جو کوئی اور کبھی دو چار ہوئے

مصر میں آج تجھے دیکھ کے پچھتائے ہیں — سادہ لوحی سے جو یوسف کے خریدار ہوئے

مبتذل ہیں ہی تو ہوں آپ جو کہیے سچ ہے — رات جھگڑے تو مجھی پر سرِ بازار ہوئے

یہ ہیں آزردہ جو کہتے ہوئے شیئاً اللہ — آج دریوزہ گرِ خانۂ خمار ہوئے

متفرق اشعار

مر کر بھی ہمارا دلِ بیتاب نہ ٹھہرا — کشتہ بھی ہوا تو کبھی یہ سیماب نہ ٹھہرا

(گلشنِ بے خار)

نہ دیکھا ہو جو کسی نے حباب میں دریا — وہ دیکھ لے مری چشمِ پر آب میں دریا

(بحر الفصاحت)

محتسب آئے تو نقشہ تری آنکھوں کا دکھائے — منہ میں ٹپکاؤں دمِ غش مئے گلنار کی بوند

(الحیات بعد الممات)

اس دردِ جدائی سے کہیں جان نہ نکل جائے — آزردہ مرے حق میں ذرا تو بھی دعا کر

(گلشنِ بے خار)

ہو نہ دامن گیر کوئی جان کر قاتل تجھے — تو بھی روتا چل جنازے کو ہمارے دیکھ کر

(گلشنِ بے خار)

برگشتہ بخت جذبۂ دل تجھ کو آفریں — آکر وہ پھر گیا مرے بیت الحزن کے پاس

(گلشنِ بے خار)

آمد آمد ہوئی پھر موسمِ گل کی شاید — ان دنوں چاک کو بانٹے ہیں گریباں سے انس

(گلشنِ بے خار)

گھر سے گھبرا کے کھلے بالوں ہر اک کھٹکے پر — کیوں نکل آتے ہو دھوکے میں جو بیتاب نہیں

(سخنِ شعراء)

پہلے آثارِ حیا بھی نہ گئے تھے اتنے — جیسے آنکھوں میں تری اب اثرِ خواب نہیں

ہزار شیوہ ہیں پنہاں کہ جی ہی جانے ہے — تری نگہ کا تغافل ہے اک جواب نہیں

(گلستانِ سخن)

عکس دنداں کا پڑے تیرے اگر پانی میں — آب ہو جائے خجالت سے گہر پانی میں

(الحیات بعد الممات)

ناصح یہاں یہ فکر ہے سینہ بھی چاک ہو — ہے فکر بخیہ تجھ کو گریباں کے چاک میں

(گلشن بے خار)

گیا کون صید افگن ادھر سے — کہ خالی پڑے آشیانے بہت ہیں

(گلشن بے خار)

یہ چھیڑ دیکھ مجھے شبِ وصل میں کہے — تو اجنبی ہے بند قبا کیونکہ وا کروں

(جلوۂ خضر)

وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں نہیں — سچ سچ بتا یہ لفظ انہی کے زباں کے ہیں

(دہلی کی یادگار ہستیاں)

گو اسیری میں ہوں پر مثلِ اسیر تصویر — نہ غمِ قید نہ پروائے رہائی مجھ کو

(گلشن بے خار)

ترے مجروح کے سینے میں کچھ گرمی سی باقی تھی — وہیں بس ہو گیا ٹھنڈا جو کھینچا تیر پیکاں کو

الجھنے کو بلا میں آپ بھی کچھ خبر ہے صاحب — لگایا ہاتھ کس نے آپ کی زلفِ پریشاں کو

(سخن شعراء)

مبتذل دوست بنایا نہ اسے کیوں اے دل — جس نے اس شوخ کی نظروں میں کیا خوار مجھے

(گلستانِ سخن)

نقشے تو بہت صانعِ قدرت نے بنائے — پر بن نہ سکا پھر دہن ایسا کمر ایسی

بالیں پہ کھڑا روتا ہے راتوں کو مسیحا　　　کچھ آن بنی ہے ترے بیمار پر ایسی

(خمخانۂ جاوید)

اس شوخ سے مربوط بہت سہل سے ہوتے　　　گر ہم بھی سبک حرکت و نا اہل سے ہوتے

(گلشن بے خار)

شہر آشوب (نوحۂ دہلی)

آفت اس شہر میں قلعہ کی بدولت آئی　　　واں کے اعمال سے دلی کی بھی شامت آئی

روز موعود سے پہلے ہی قیامت آئی　　　کالی میرٹھ سے یہ کیا آئی کہ آفت آئی

گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

جو سنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

جن کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا　　　اہل دنیا اہل سے کچھ خلط کہیں زنہار نہ تھا

ان کی خلوت سے کوئی واقف دہمراز نہ تھا　　　آدمی کیا ہے فرشتہ کا بھی واں بار نہ تھا

وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشاں دردر

خاک بھی ملتی نہیں ان کو کہ ڈالیں سر پر

زیور اک لباس کا سب جن سے نہ پہنا جاتا　　　بھاری جھومر کبھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا

گاچ کا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا　　　لاکھ حکمت سے اوڑھاتے نہ اوڑھایا جاتا

سر پہ وہ بوجھ لیے چار طرف پھرتے ہیں

دو قدم چلتے ہیں مشکل سے تو پھر گرتے ہیں

طبع جو گہنے سے پھولوں کے اذیت پاتی　　　مہندی ہاتھوں میں سوتی تو کیا گھبراتی

صبح سے شام تلک نیند نہ ان کو آتی　　　ایک سلوٹ بھی بچھونے میں اگر پڑ جاتی

ان کو تکیہ کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا

سنگ پہلو سے اوٹھایا تو سرہانے رکھا

جن کو بن دوش پرستار نہ چلتے دیکھا　　　صبح سے شام تلک عطر ہی ملتے دیکھا

کبھو بیدار نہ سورج کو نکلتے دیکھا
پانوں دابے پہ بھی کروٹ کو بدلتے دیکھا

وہ ہیں اور دشت ہیں اور کوہ ہیں اور نالے ہیں
قدم اٹھتا نہیں پانوں میں پڑے چھالے ہیں

عیش و عشرت کے سوا کچھ بھی نہ تھا جن کو کام
لٹ گئے، کچھ نہ رہا، ہو گئے بالکل برباد
ٹکڑے ہوتا ہے جگر سن کے یہ ان کی فریاد
پھر بھی دیکھیں گے الٰہی کبھی دہلی آباد

کب تلک داغ دل ایک ایک کو دکھلائیں ہم
کاش ہو جائے زمیں شق تو سما جائیں ہم

دیکھ سکتے نہ تھے جس بات پہ وہ اڑتے تھے
صلح سے زیادہ مزا تھا جو کبھی لڑتے تھے
پانوں رکھتے تھے کہیں اور کہیں پڑتے تھے
آنچلوں سے نرے مغیش پڑے جھڑتے تھے

ان کو رونے کے سوا شغل نہ کچھ رہتا ہے
ایک دریا ہے کہ آنکھوں سے پڑا بہتا ہے

عطر صندل میں جو دامن کو بسایا کرتے
کنٹھے موتی کے گریباں میں لگایا کرتے
بیٹھ خلوت میں جو زلفوں کو بنایا کرتے
یہ سنگار آئینہ کو بھی نہ دکھایا کرتے

اب نہیں کچھ بھی انھیں زلف پریشاں کی خبر
نہ گریباں کی خبر اور نہ داماں کی خبر

روز بن ٹھن کے نکلنا وہ جوانوں کا کہاں
بیٹھنا ناز و ادا سے وہ دوکانوں کا کہاں
شور ہر کوچے سے بیٹوں کی وہ تانوں کا کہاں
لطف ساقی کا مزا اور وہ کانوں کا کہاں

وہ مغنی نہ رہا اور وہ ساقی نہ رہا
دھوتی بندوں کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا

شکل ایسی کہ خدا اس کو نہ پھر دکھلائے
ان کی پوشاک کو دیکھیں تو پھریری آئے
نظر آجائیں اگر وہ سر راہ لگا ہے
خون اپنا کریں یا اون کا یہی جی چاہے

جن کے ہاتھوں سے نہ لیں پیر بھی دو کوڑی کے
چاندنی چوک میں پھرتے ہیں وہ اجلے گھلے۔

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوش جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے

ٹکڑے ہوتا ہے جگر، جی ہی پہ بن جاتی ہے
مصطفٰے خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیوں نہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

(فغان دہلی مطبوعہ فیض منبع گرامی فتح الکریم بمبئی ۱۳۰۳ھ)

کتابیات

۱۔ القاء المنن بالقاء المحن مصنفہ نواب صدیق حسن خاں مطبع شاہجہانی بھوپال

۲۔ اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین " " مطبع نظامی سنہ ۱۲۸۸ھ

۳۔ ابجد العلوم " " " مطبع صدیقیہ بھوپال سنہ ۱۲۹۶ھ

۴۔ شمع انجمن " " " مطبع شاہجہانی سنہ ۱۲۹۳ھ

۵۔ حدائق الحنفیہ مولانا فقیر محمد جہلمی لاہوری " نولکشور " لکھنؤ

۶۔ تذکرہ علمائے ہند رحمان علی " " " سنہ ۱۹۱۴ء

۷۔ آثار الصنادید سر سید احمد خاں " سنہ ۱۸۷۶ء

۸۔ حیات جاوید " " مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۹۔ یادگار غالب مولانا الطاف حسین حالی دائرہ ادبیہ لکھنؤ

۱۰۔ مقدمہ شعر و شاعری " "

۱۱۔ گلشن بے خار نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نولکشور لکھنؤ سنہ ۱۹۱۰ء

۱۲۔ مقدمہ کلیات حسرتی و شیفتہ مرتبہ نظامی بدایونی بدایوں سنہ ۱۹۱۶ء

۲۳۔ آبحیات محمد حسین آزاد مطبع کریمی لاہور طبع یازدہم

۱۴۔ الثورۃ الہندیہ یعنی باغی ہندوستان۔ عبدالشاہد خاں شروانی حبیب گنج علی گڑھ

۱۵۔ مرحوم دہلی کالج مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔ (پاکستان)

۱۶۔ واقعات دار الحکومت بشیر الدین احمد۔ شمسی پریس آگرہ۔ سنہ ۱۹۱۹ء

۱۷۔ تذکرہ کاملان رامپور۔ حافظ احمد علی خاں شوق رامپوری ہمدرد پریس دہلی

۱۸۔ لال قلعہ کی ایک جھلک ناصر نذیر فراق دہلوی دہلی

۱۹۔ دلی کی آخری شمع مرزا فرحت اللہ بیگ "

۲۰۔ تذکرہ شعرائے ہند مولوی کریم الدین مطبع العلوم مدرسہ دہلی

(۲۱) طبقات شعرائے ہند — مولوی کریم الدین — مطبع العلوم مدرسہ دہلی سنہ ۱۸۴۸ء

۲۲ - فرائد الدہر — مصنفہ مولوی کریم الدین — سنہ ۱۸۴۷ء

۲۳ - اخبار الصنادید — ″ نجم الغنی رامپوری — نولکشور لکھنؤ سنہ ۱۹۱۸

۲۴ - حیات العلماء — ″ مولانا سید محمد عبد الباقی سہسوانی — ″ سنہ ۱۹۲۳ء

۲۵ - سوانحعمری مولوی سمیع اللہ خاں مصنفہ مولوی ذکاء اللہ مطبع انوار الاسلام حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۰۹ء

۲۶ - الحیات بعد الممات مصنفہ مولوی فضل حسین بہاری مطبوعہ اکبری آگرہ سنہ ۱۹۰۰ء

۲۷ - امیر الروایات — امیر خاں صاحب — دہلی

۲۸ تاریخ عروج عہد انگلشیہ مولوی ذکاء اللہ شمس المطابع دہلی سنہ ۱۹۰۴ء

۲۹ - کنز التاریخ مولوی رضی الدین صدیقی بدایونی نظامی پریس بدایوں سنہ ۱۹۰۷ء

۳۰ - تذکرۃ الرشید — مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔

۳۱ - تذکرۃ الخلیل — ″ ″ ″

۳۲ غدر کے چند علماء — مفتی انتظام اللہ شہابی۔ — دہلی

۳۳ مشاہیر جنگ آزادی — ″ ″ ″

۳۴ علمائے ہند کا شاندار ماضی مولانا سید محمد میاں صاحب الجمعیۃ بکڈپو دہلی

۳۵ - داستانِ غدر — سید ظہیر دہلوی — دہلی

۳۶ - خمخانۂ جاوید — لالہ سری رام دہلوی — دہلی سنہ ۱۹۰۸ء

۳۷ گل رعنا — مولوی سید عبد الحئی — دار المصنفین اعظم گڑھ

۳۸ - سخن شعراء — عبد الغفور نساخ — نولکشور ، لکھنؤ

۳۹ - گلستانِ سخن — مرزا قادر بخش صابر — ″ سنہ ۱۸۸۲ء

۴۰ غالب — غلام رسول مہر — عالمگیر پریس لاہور سنہ ۱۹۴۶ء

۴۱ - سنہ ۱۸۵۷ء — ″ ″ — لاہور

۴۲ جلوۂ خضر — سید صفیر احمد بلگرامی — مطبع نور الانوار آرہ سنہ ۱۸۸۵ء

۴۳ طور کلیم سید نورالحسن خاں مفید عام آگرہ ۱۲۹۶ھ

۴۴ روز روشن مظفر حسین مطبع شاہجہانی بھوپال ۱۲۹۷ھ

۴۵ ۔ کلیات غالب ۔ مرزا اسداللہ خاں غالب : مطبع نولکشور ۱۲۷۹ھ

۴۶ ۔ عود ہندی " " نیشنل پریس الہ آباد ۱۹۲۸ء

۴۷ اردوئے معلی " " " " "

۴۸ ۔ انتخاب یادگار امیر مینائی تاج المطابع ۔ رام پور ۱۲۹۰ھ

۴۹ ۔ بحرالفصاحت نجم الغنی رام پوری نولکشور لکھنو

۵۰ فغان دہلی ۔ مرتبہ ظہیر دہلوی فیض منبع گرامی فتح الکریم بمبئی ۱۳۰۳ھ

۵۱ ۔ الدرر المفیہ تحفۃ الحنفیہ مولانا عبدالغفور دانا پوری ۔ اینیخ پریس بانکی پور پٹنہ

۵۲ ۔ تاریخ المشاہیر قاضی سلیمان منصور پوری ، دکمیل پریس ۔ امرتسر

۵۳ ۔ علم و عمل یعنی وقائع عبدالقادر خانی ۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی

۵۴ ۔ ہندوستان کا نظام تعلیم و تربیت ۔ مولانا مناظر احسن گیلانی ۔ ندوۃ المصنفین دہلی

۵۵ ۔ نزہتہ الخواطر مولانا سید عبدالحئی حیدر آباد

۵۶ ۔ دہلی کا آخری سانس سید محمد ناصر دہلوی حلقہ مشائخ دہلی ۱۹۴۵ء

۵۷ ۔ تذکرہ ریاض الفردوس محمد حسین شاہجہانپوری نولکشور پریس لکھنو ۱۸۶۶ء

۵۸ سیر المتاخرین سید غلام حسین " " ۱۳۱۴ھ

۵۹ گلشن ہمیشہ بہار نصر اللہ خاں خویشگی ۔

۶۰ ۔ بہادر شاہ اور ان کا عہد رئیس احمد جعفری لاہور (پاکستان)

۶۱ ۔ مقالات سرسید عبداللہ خویشگی

۶۲ مومن کلب علی خاں فائق رامپوری انجمن ترقی ادب لاہور

۶۳ کلاسیکی ادب خواجہ احمد فاروقی آزاد کتاب گھر ۔ دہلی

۶۴ آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی ۔ عبدالرزاق ملیح آبادی ۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

۶۵ تاریخ مشائخ چشت ۔ خلیق احمد نظامی ندوۃ المصنفین ۔ دہلی

۶۶ تلامذۂ غالب مالک رام دہلی

۶۷۔ حالات مشائخ کاندھلہ احتشام الحسن کاندھلوی

۶۸ تذکرہ شیخ الہند۔ مفتی عزیز الرحمٰن ۔ مطبوعہ دیوبند

۶۹ محمد احسن نانوتوی محمد ایوب قادری کراچی

۷۰۔ سوانح قاسمی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ ندوۃ المصنفین۔ دہلی

۷۱ منشی عبداللطیف خاں کا روزنامچہ مرتبہ خلیق احمد نظامی ″

۷۲ جیون لال کا روزنامچہ ″

۷۳ بہادر شاہ کا روزنامچہ ″

۷۴ دہلی کی یادگار ہستیاں امداد صابری ″

۷۵۔ ترجمہ تذکرہ علمائے ہند مع تکملہ و حواشی۔ محمد ایوب قادری ریسرچ ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی

اخبارات و رسائل

۱۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور ۱۹۶۲ء

۲۔ آجکل دہلی فروری ۱۹۵۲ء

۳۔ ماہنامہ تحریک اگست ۱۹۵۷ء

۴۔ تحریر نماہی۔ علمی مجلس دہلی ۱۹۷۰ء

۵۔ نگار لکھنؤ اکتوبر ۱۹۵۷ء

۶۔ اکمل الاخبار ہفتہ وار دہلی ۱۸۸۵ء

۷ دہلی اردو اخبار دہلی ۱۸۵۳ء

۸ - نصرت نامہ گورنمنٹ — دہلی

۹ - کرزن گزٹ — دہلی مارچ سنہ ۱۹۱۲ء

۱۰ - رسالہ معارف — اعظم گڑھ جون سنہ ۱۹۳۷ء

۱۱ - اردو نامہ سہ ماہی۔ کراچی - ماہ اپریل و جون سنہ ۱۹۶۴ء

۱۲ - آگرہ گزٹ (انگریزی) سنہ ۱۸۴۴ء

تمت

نئی اور اہم مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
مفتی صدرالدین آزردہ	پرواز اصلاحی	۱۲/-
اُردو گیت	ڈاکٹر قیصر جہاں	۱۲/-
مسلمان اور وقت کے تقاضے	مولانا عبدالسلام قدوائی	۸/-
انشائیات	ڈاکٹر سید عابد حسین	۱۵/-
فسانۂ غالب	مالک رام	۱۶/۵۰
تذکرۂ معاصرین دوم	مالک رام	۱۴/-
حیات اسماعیل میرٹھی	ڈاکٹر سیفی پریمی	۱۸/-
نوائے آوارہ	غلام ربانی تاباں	۸/۵۰
گریۂ آگہی	آنند نرائن ملا	۱۰/۵۰
کو بکو	سلمان اختر	۴/-
تعلیم اور سماج	سید انصاری	۵/-
تاریخ کیسے پڑھائیں	مسرور ہاشمی	۸/-
نفرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	۱۲/-
گاندھی باباکی کہانی	بیگم قدسیہ زیدی	۳/-
دلی کی بیگماتی زبان	محی الدین حسن	۴/-
ذکر غالب	مالک رام	۱۵/-
رموز غالب	ڈاکٹر گیان چند	۱۸/۵۰
میر انیس سے تعارف	صالحہ عابد حسین	۴/-
اقبال اور مغربی مفکرین	جگن ناتھ آزاد	۱۰/۵۰
جدید اُردو ادب	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/-
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	۳/-
کچھ نثر میں بھی	آنند نرائن ملا	۱۶/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	۱۱/-
عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا	محمود الحسن	۱۵/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ۔ عبداللطیف اعظمی	۱۲/۵۰
اُردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	۴/-
پچھلے پہر	جاں نثار اختر	۶/-
بیاض مریم	سکندر علی وجد	۱۲/-
مسالک و مناہج	ضیاء احمد بدایونی	۲۲/-
سماجی تبدیلیاں از منۂ وسطیٰ کے ہندوستان میں	رام شرن شرما	۲/-
قدیم دلی کالج	مالک رام	۴/۵۰
انتخاب حالی	مرتبہ۔ سفارش حسین رضوی	۹/۵۰
یادوں کے سائے	عتیق صدیقی	۱۸/-
نوازش میر	نثار احمد فاروقی	۱۱/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	۵/۵۰
جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ	ضیاء الحسن فاروقی	۴/-
مذہب اور جدید ذہن	ڈاکٹر مشیر الحق	۸/۵۰
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	۱۶/-
نظر اور نظریے	آل احمد سرور	۱۳/۵۰
ہمارے ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی	۹/-

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس دریا گنج دہلی ۱۱۰۰۰۲